پہچان
خالدہ حسین

جیلانی بانو کے لیے
خلوص کے ساتھ۔
خالدہ حسین
اسلام آباد
13.8.86

پہچان

خالدہ حسین

سرورق : ـــــــ صغریٰ حسین

طباعت : ـــــــ فیروز سنز پرنٹرز کراچی لمیٹڈ

اشاعت اوّل : ـــــــ ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء

تعداد : ـــــــ ایک ہزار ـــــــ

کتابت : ـــــــ عبدالجمیل دہلوی

قیمت : ۴۵ روپے

کتاب ملنے کا پتہ :

خالد پبلیکیشنز

۱۲- ڈی۔ حسن سینٹر

گلشن اقبال ، کراچی۔

فہرست

صفحہ نمبر

"نئی کہانی"

سُننے میں آیا ہے کہ "نیا افسانہ اب نیا نہیں رہا"
مگر اس لفظ نئے کے معنوں کا تعین کون کرے گا۔ سنہ ۳۶ء سے سنہ ۵۶ء تک لکھے جانے والے ترقی پسند افسانے اپنے وقتوں میں نئے تھے۔ آج کے نئے افسانے کل کو پرانے ہو جائیں گے۔ افسانہ یا کسی بھی فنی تخلیق کو وقت کے اعتبار سے نیا یا پرانا کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہاں اگر آپ کسی نئے رجحان کی بات کریں۔ مثلاً سرریلزم۔ علامتیت اور اب لامعنویت یا وجود کی آزادی کا خبط وغیرہ جو اکثر ہمارے ہاں باہر سے درآمد ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سب سوچوں کے سرچشمے ہمارے صوفیانہ ادب میں (اثباتی رنگ میں) سینکڑوں برس پہلے سے موجود ہیں۔ آپ وجودیت اور مسئلہ جبر و قدر کو سارتر کے ہاں سے لائیے یا اپنے تصوّف سے بات تو وہی ہے۔ مگر جب اس کو فیشن اور مصلحت پسندی کے طور پر اپنایا جائے گا تو وہ نہایت مبتذل اور بے کار ادب پیدا کرے گا۔

ہر احساس اور فکر کا سوتا خود انسان کی اپنی ذات سے اور زیادہ صحیح الفاظ میں تحت الذات سے پھوٹتا ہے۔ آپ اس کو انسان کا سایہ کہہ لیجیے۔ جو لکھنے والا اس سایہ کا احساس نہیں رکھتا۔ اس کو پہچانتا نہیں اس کی تخلیقات یقیناً نئی اور پرانی کی حدود میں مقید ہیں۔ (ان کا انحصار زیادہ تر خارجی فارم۔ ڈکشن نکتوں۔ وقفوں اور پیکروں کے چھوٹے بڑے ہونے پر ہوگا) اپنے سایہ کی پہچان کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) انسان کو اپنی ذات کے سایہ کا احساس ہی نہ ہو اور وہ بطور فیشن تاریکی

باہر سے مول لے۔ اس صورت میں اس کی کہانی یا تخلیق اقلیدس کا مسئلہ بن کر پڑھنے والوں کو پریشان و حیران ہونے کا موقع ضرور فراہم کرے گی۔

(۲) اسکو اپنے سایہ کا احساس ہو اور وہ اس کو اپنے اوپر مُسلّط کرے اس سے شکست کھا جائے۔ ABSURD ادب تخلیق ہو گا۔

(۳) اس کو اپنے سایہ کا احساس ہو اور وہ اس سے مغرور ہو۔ اس صورت میں وہ لفظوں کے چکر میں اُلجھ کر نیم رومانی نیم شکست خوردہ ادب پیدا کرے گا۔
ایک چوتھی قسم اپنے سایہ کی پہچان کی یہ ہے کہ انسان اس سایہ کو خود اپنی ذات کی اصل جان کر اس کو قبول کرے۔ اس کی تاریکیوں میں اتر کے مصلحت پسندیوں سے بغاوت کر کے اپنے اور اس سایہ کے رشتہ کا تعین کرے۔ اس کا تعلق زندگی کے خارجی عوامل سے پختہ کرے۔ اس کو اپنے سب کونشس کی پہچان کہہ لیجئے اس کی "امیجز" کبھی غلط نہیں ہوتیں۔ لکھنے والے کا کام ان امیجز کو سمجھنا اور ان کا اپنی جیتی جاگتی زندگی اور عملی حیات کے ساتھ رشتہ جوڑنا ہے۔ اس نیم خوابیدہ زندگی کو گرفت میں لا کر جاگتی زندگی کے لئے مفید بنانا ہے اس سلسلے میں ہم بہت راہ بھٹکتے ہیں۔ بہت گھاٹے کھاتے ہیں۔ بہت زیادہ عالم بن بیٹھتے ہیں۔

مگر سب سے بڑھ کر جو چیز ہماری راہ میں حائل ہے وہ ہے اثبات کا خوف ہم اثبات سے اس لئے خوف زدہ ہیں کہ اپنے سایہ سے خوف زدہ ہیں۔ جس دن ہم اس سایے کو پہچان لیں گے۔ اس روز ہم یہ جان جائیں گے کہ اس سایہ کے ساتھ ہی روشنی کا دروازہ بھی کھلتا ہے۔ اور ہمیں اس روشنی سے خوفزدہ ہونے اس کی خواہش پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔
شاید ہمارے ہاں عورتیں اس سلسلے میں زیادہ مخلص ہیں۔ غالباً اس لئے

کہ وہ ہمہ وقت اپنے سایے کے ساتھ زندہ ہیں۔ دوسرے لوگ ان کو اس سایے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ان کا احسان ہے۔

اب پکار یہ ہے کہ کہانی میں کہانی کو واپس آنا چاہیئے۔

اچھی کہانی سے کہانی کبھی رخصت ہی نہیں ہوئی جو اب اس کو زبردستی پکڑ دھکڑ کے واپس لایا جائے گا۔ جہاں کہانی نہیں۔ وہ کہانی کہلانے کی مستحق نہیں۔ کہانی کا سحر وہ سحر ہے جو ازل سے انسان کو مسحور کرتا چلا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ خواہ اسمیں راستہ بھول جانے ہی کا خطرہ کیوں نہ ہو۔ انسان اس کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ فارمولا کہانیاں لکھیں۔ کہانی تو صرف تجربہ کا خلوص۔ لکھنے والے سے جان کا ہی مانگتی ہے اور سچ اور جان کا ہی۔ یہی ہمارا سایہ ہے۔ ہماری تاریک ذات۔ چنانچہ محض انٹلکچوئل یا ناقابل فہم بننے کیلئے یا محض چند قاری ذہن میں رکھ کے کچھ لکھنا بے کار محض تضیع اوقات لکھنے والا جب اپنے وجود کے تاریک کنوئیں کو محبت سے اپنے سینے کے ساتھ لگاتا ہے۔ اس کی گہرائیوں سے آتی آواز کو سنتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ روشنی کی پرت اس اندھیرے کی پرت کے ساتھ ہی چسپاں ہے۔ خواہ وہ اس تک پہنچ پائے یا نہیں۔ مگر اس کو تسلیم ضرور کرے۔ اس تک پہنچنا تو اس کی جان کا ہی کے درجات اور کچھ اس کے مقدر پر منحصر ہے تو اس صورت میں جو ادب تخلیق ہوگا وہ نئے پرانے کی حدود سے آزاد ہوگا۔

—— خالدہ حسین

اِک بُوند لہو کی

یہ ایک طویل جامد لمحہ کی داستان ہے۔

اس لمحے کا آغاز تو نا معلوم کب ہوا، مگر اس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا، جب کافی ہاؤس میں، اپنے دوست فاروق کی نظموں پر بحث کرتے کرتے، ایک دم مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہونے لگی (یعنی۔ آواز مجھ سے الگ کافی ہاؤس میں گونج رہی تھی) بہت سے انسان میرے گرد بیٹھے تھے جن کو میں دوست کہتا تھا۔ اور آج پہلی بار میں نے دیکھا کہ ان انسانوں کے چہرے بھی دراصل ان ہی انسانوں ایسے ہیں جو میرے دوست نہیں۔ جو میرے قریب سے گزر جاتے ہیں اور جن کو میں پہچانتا تک نہیں۔ لہذا یہ لوگ جو میرے سامنے بیٹھے ہیں دراصل الگ الگ کئی حصوں سے مل کر بنے ہیں۔ میری آنکھیں ان حصوں کو الگ الگ دیکھ رہی تھیں۔ اور ان حصوں کو جوڑنے والی نظر مر چکی تھی۔ جیسے سکرین پر متحرک فلم دیکھنے کے بجائے، آپ اس کا پرنٹ ہاتھ میں پکڑے دیکھ رہے ہوں، ایک حرکت کے سینکڑوں جامد ٹکڑے!

چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ امجد میرے دوست نے میرا شانہ ہلایا۔

"چُپ کیوں ہو گئے"؟ اس نے پوچھا۔

"دراصل ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا کوئی مفہوم نہیں۔ میں نے کہنا چاہا، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ فقرہ بھی کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اس لئے میں خاموش بیٹھا کافی پیتا رہا۔ اور لوگ فاروق کی نظموں پر بحث کرتے رہے۔ میں جو اس وقت اس محفوظ ریستوران

میں بیٹھا تھا۔ بے تحاشا، اندھا دُھند موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے دیکھا، ماں باورچی خانے میں بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ اور نمی میری بہن آپا کے بچے کا سوئیٹر بُن رہی تھی۔ اور حامد میرا چھوٹا بھائی سائیکل کی اُتری ہوئی چین چڑھا رہا تھا۔ ابّا میاں کمبل میں لپٹے موڑھے پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ آنگن میں اندھیرا پھیلا تھا جہاں سے رات کی رانی کی مہک آرہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے یہ منظر پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں یہ لمحہ پہلے بھی گزار چکا ہوں، چنانچہ آنے والے وقت میں کوئی نیا لمحہ نہیں۔ چیزوں کے گرد سے ایک نامعلوم سی دُھند چھٹ چکی تھی۔ اور وہ پتھریلی برہنگی میں میرے سامنے بکھری پڑی تھیں۔ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ میں ان لوگوں، اس گھر کے قریب سے اسی طرح گزر جاتا، جس طرح بہت سے اجنبی لوگ گزر جاتے ہیں۔ تو شائد اس وقت بھی کوئی اس دروازے کے قریب سے گزر گیا ہے۔ کوئی اجنبی۔ جو "اپنے گھر" کی طرف جا رہا ہے۔ وہ گھر جس کے قریب سے میں۔ ایک اجنبی گزر جاتا ہوں میں اس انسان کی نظروں سے وہ سب کچھ دیکھتا رہا جو اس گھر کے قریب سے گزر گیا تھا۔

ماں نے ابّا میاں کے سامنے کھانے کی سینی تخت پر رکھ دی،

"ہسپتال گئے تھے؟ ماں نے مجھ سے پوچھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ آپا کا بچہ گکو بیمار ہے، اور میں دراصل اسے دیکھنے ہسپتال جا رہا تھا مگر راستے میں کافی ہاؤس ٹھہر گیا۔ پھر اس اٹل لمحے نے مجھے گھیر لیا تھا۔ "نہیں" میں نے جواب دیا۔ اور میرے اندر کہیں دُور دور تک پیار کی وہ چبھن اور میٹھے میٹھے دکھ کا احساس نہ تھا، جو گکو کے ساتھ وابستہ تھا۔ اندھا خلا میرے اندر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ لمحے بھر کو گکو کے سرخ سرخ گال اور چمکتی آنکھیں میری نظروں کے سامنے گھومیں اور پھر اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

ابّا میاں نے زور کا ہنکارا بھرا۔

"اس کمبخت گھر میں کسی کو کسی کا خیال تک نہیں۔ اچھا خاصا میں خود جا رہا تھا، روک دیا۔"

مجھے ابا میاں کی جھنجھلاہٹ پر دُکھ اور پشیمانی بھی نہ ہوئی۔ (جو ہمیشہ ہوتی تھی) دراصل تکلیف اور دُکھ کا تصوّر میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ مثلاً ککو کے گلے کا اپریشن ہوا تھا، اور اسے بے حد تکلیف تھی، مگر یہ تکلیف کیا تھی؟ میرے ذہن کے گرد اندھیرے کی دیوار تھی۔ تمام تصوّرات اس کے ساتھ ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو رہے تھے۔ اس وقت شدّت سے میرا جی چاہا کہ مجھے کوئی چوٹ لگے اور بے پناہ درد کی ٹیسوں سے میں تلملا اُٹھوں۔

سونے کے لئے جب میں بستر میں لیٹا، مجھے اپنے جسم کا بوجھ، اپنے سے الگ محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں کسی اور کا جسم اُٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں۔ میں خاموش لیٹا اندھیرے میں چھت کو دیکھتا رہا۔ میرے اپنے دل کی دھڑکن میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ پھر میں ایکدم چونک گیا۔ برابر کے کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ اور ماں کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اپنڈکس کا درد۔ میں بے خبری ہی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماں کی آواز اب صاف آ رہی تھی۔ قے کی وہ بھیانک آواز جس سے میرا تمام جسم لرز جاتا تھا۔ مگر اس وقت وہ محض ایک آواز تھی جس کو میں پہلے بھی سُن چکا تھا۔ میرے دل میں وہ گہرا دُکھ نہ جاگا، جب میرا جی چاہتا تھا کہ ماں کی گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگوں۔ میں دروازے کے ساتھ لگا ماں کی آواز سُنتا رہا۔

کھٹاک سے باورچی خانے کا دروازہ کھُلا۔ نمّی پانی گرم کرنے باورچی خانے میں گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، ماں چارپائی کی پٹی پر کہنیاں جمائے سلفچی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کمرے کی دیوار کی طرح زرد تھا۔

"یہ جسم کا درد ہے" میں نے سوچا، اس درد میں کسی ذہنی تصوّر کا گزر نہ تھا۔ یہ کرب بالکل خالص تھا۔ میں نے جھک کر ماں کا سرد ہاتھ سینے سے لگا لیا۔ مگر میرے اندر کا اندھا خلا اسی طرح سائیں سائیں کرتا رہا، اس وقت مجھے یوں لگا میں لکڑی کا ایک خول ہوں اور اس خول کے اندر کچھ بھی نہیں۔

"تو کیوں آگیا؟ جا جا کے سو رہ۔ صبح کالج جانا ہے" ماں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ نمّی گرم پانی کی بوتل لے آئی، اور ابا میاں کی چلم بھی۔

"صبح ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں، آپریشن کا۔ ہزار بار کہا ہے، مگر تکلیف میں کچھ مزا آتا ہے۔" ابا میاں نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"دُکھ کیسا ہوتا ہے؟" میں نے بہت کچھ یاد کرنے کی کوشش کی، مگر اندھیرے کی دیوار کے پار کسی تصور کا گزر نہ تھا، اپنے کمرے میں جا کر میں نے شیونگ کِٹ میں سے بلیڈ نکالا، اور ہولے سے انگلی پر پھیرا۔ خون کے ننھے ننھے قطروں کی ایک لکیر سی اُبھر آئی۔ اک کھنچے ہوئے درد اور جلن کا احساس انگلی سے ہوتا تمام جسم میں سرایت کر گیا "یہ میں ہوں۔" ٹپ ٹپ خون کے قطرے نیچے زمین پر گرنے لگے۔ ان کو دیکھ کر میں کانپ گیا۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کیا ہو گیا ہے" میں نے تکیے میں منہ چھپا کے رونے کی کوشش کی، خشک ہچکیوں سے میرا جسم لرزنے لگا۔ مگر وہ ہچکیاں بھی میری نہ تھیں!

یونیورسٹی میں مجھے سب کے چہرے اجنبی نظر آئے، آج میں نے ہر چہرے کی تفصیل دیکھی۔ آنکھوں کی لمبان، پلکوں کے خم، اور مختلف پروفائل۔ امجد کی عینک کا فریم، اور محض فریم، امجد سے الگ، سپاٹ سیاہ پس منظر میں۔

فاروق نے پھر اپنی نظموں والا رسالہ میرے سامنے لا رکھا۔

"بولو!" اس نے کہا۔

"تم نظمیں کیوں لکھتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی چمک کر غائب ہو گئی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"تمہارا موضوع کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا کوئی موضوع ہے؟" اور مجھے بڑے زوروں کی ہنسی آ گئی۔ چنانچہ میں ہنستا رہا، اور پھر خاموش ہو گیا۔

"مت ماری گئی ہے۔" فاروق نے رسالہ مروڑتے ہوئے کہا۔

اب میں امجد، فاروق، نسیم احمد گیلانی، اور اسد حمید کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھا اپنے دل کی دھڑکن سنتا، اور کنپٹیوں میں اُبلنے والے لہو کی تپش محسوس کرتا رہتا اور بے شمار لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا۔ اُن لوگوں کو بھی جو وہاں نہ آتے، مگر کہیں تھے۔ کسی گھر

میں۔کسی سڑک پر، اور میں وہ انسان بھی تھا جو وہاں نہیں تھا۔ کیونکہ وجود محض ایک ہے، خواہ کہیں بھی ہو۔ (اس وقت بھی کہیں سوکھی گھاس میں چیونٹیاں اپنا رستہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور پرندوں کے سینے میں دل ایک ہی انداز سے دھڑک رہے تھے۔ اور وجود کا احساس چمکتی دھوپ بن کر کائنات پر پھیلا تھا۔ وجود کا احساس محض جس کے بعد اندھیرا تھا اور سکوت۔)

اب بھی ڈیپارٹمنٹ کی روشوں اور سیڑھیوں سے ناہید ظہیر الدین اپنے گورے پاؤں سے گزر جاتی۔ اور اُسے دیکھ کر میرا دل تیزی سے نہ دھڑکتا۔ وہ بھی محض ایک اسم تھی۔ میرے ذہن کا وہ بے رحم شور مر چکا تھا جو اُسے دیکھ کر سیاہ لہو بن کر میرے گلے میں اٹک جاتا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اگر اس سیاہ لہو کو میں نے ناہید ظہیر الدین کے سامنے نہ اگلا تو کائنات چٹخ کر بکھر جائے گی۔ اب اس سے کہنے کو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے مہینوں لائبریری کے گیٹ پر گرمیوں کی لمبی دوپہریں گزاری تھیں۔ (محض اسے ایک نظر دیکھنے کی خاطر)۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مجھے اس کی تمام ساریوں کے رنگ یاد تھے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بالوں میں کس کس جگہ پر پنیں لگاتی ہے۔ اور اس کی انگوٹھی میں سات نگینے جڑے ہیں، چار سرخ اور تین سفید۔ میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ میری جتنی نظمیں بھی مقبول ہوئیں وہ سب اسی کی خاطر کہی گئی تھیں۔ اور ایک بار میں نے سب سے آخر میں لیکچر روم سے نکلتے ہوئے اس کی سیٹ پر سے کاغذ کے وہ چھوٹے چھوٹے پرزے بھی اُٹھائے تھے جو وہ بے خبری میں مسل مسل کر ڈیسک پر پھینکے جا رہی تھی اور وہ ٹکڑے ابھی تک میرے میز کے دراز میں پڑے تھے۔) میں راتوں کو محض اس وجہ سے نہیں سو سکا تھا کہ اس کے نوٹس میرے پاس تھے۔ (وہ کاغذ جن کو اس کے ہاتھوں نے چھوا تھا) اور جب پہلی بار اُس نے مجھ سے بات کی تھی۔ " کیا آپ یونین کی افتتاحی تقریب میں شرکت کریں گی؟ " میں نے پوچھا تھا۔ "جی نہیں" اس نے اپنی انگلی میں انگوٹھی گھماتے ہوئے کہا تھا " واپسی میں بہت رات ہو جائے گی۔") تو میں نے نمی اور حامد کو فلم دکھائی تھی۔ اور تمام دن سڑکوں پر گاتا پھرا تھا۔ پھر میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ لوگوں کے واہ واہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جس کے دکھ نے مجھ سے نظمیں کہلوائیں اس کو خبر تک نہیں۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ پھر میں نے دل

سے اُٹھتی خوشی اور لبوں پر آتی مسکراہٹ کو روک کر کہا تھا۔ "آپ نے کبھی بتایا نہیں۔ آپ کو میری نظمیں کیسی لگتی ہیں۔ مثلاً یہ آخری والی!"

مگر اب، اس اٹل لمحے کے بعد سب کچھ مر چکا تھا۔ اس لمحے نے مجھ سے پوچھا تھا۔ اگر ناہید ظہیر الدین مل بھی جائے تو کیا ہو گا؟ وہ بھی تمہاری طرح محض ایک اسم ہے۔ وہ پتھر کی دیوار تو نہ ٹلے گی، جو تمہارے اور زندگی کے درمیان حائل ہے۔"

چنانچہ میں ناہید ظہیر الدین کو شیشے کی سی بے حسی کے ساتھ قریب سے گزرتا دیکھنے لگا۔ اس کی مخصوص مہک کا مفہوم بھی ختم ہو چکا تھا۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" احتیاج کا تصور مر چکا تھا۔ ہر چیز اپنا وزن کھو کر فضا میں پانی کی طرح تیر رہی تھی۔

میں یونیورسٹی کے رستوں پر مہینوں اپنے جسم کا بوجھ اُٹھائے پھرتا رہا۔

ماں نے ابّا میاں سے کہا۔

"اجی۔ کچھ باؤلا سا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے کبھی دیکھا کیسے چپ چاپ اپنے سامنے تکے جاتا ہے؟"

میں اپنے کمرے میں بہت دیر سے، کرسی پر بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ ابا میاں زور سے کھلنسے۔

"پڑھائی سے بھاگتا ہے اور کیا ہے، خاک باؤلا ہو رہا ہے۔ اس اولاد نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چھوٹے میاں کو ریڈیو کے کانوں ہی سے فرصت نہیں ہوتی؟"

ماں نے ہولے سے کہا "نہیں یہ بات نہیں۔ اجی۔ تو اب تک وظیفے لیتا آیا ہے۔ اور جانے رسالوں میں اس کا کیا کچھ چھپتا رہتا ہے۔ آپ کو کچھ پروا ہو تو دیکھیں۔ میں کہتی ہوں، اُسے نظر تو نہیں ہو گئی۔؟"

ابّا میاں اتنی زور سے ہنسے کہ اُچھو آ گیا۔

"بڑا یوسفِ ثانی ہے نا نظر ہو گئی۔"

"آپ نہیں جانتے، امتحان کے دن جو نزدیک ہوئے۔ دشمنوں کا پتہ تھوڑی چلتا ہے۔ اس جمعرات کو پیروں کے گھر جاؤں گی۔"

اس سے اگلے روز کا ذکر ہے کہ فاروق کا اسکوٹر ٹرک سے ٹکرا گیا۔ اور وہ انسان جس کو فاروق کہا جاتا تھا مر گیا۔ میں فاروق کے گھر گیا۔ برآمدے میں لوگوں کے ہجوم میں اس کا پلنگ رکھا تھا۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک سرد سنسنی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسی ناممکن بات اس وقت کیسی فطری نظر آ رہی تھی۔ میں یہ لمحہ پہلے بھی گزار چکا تھا۔ فاروق جو شاعری کرتا تھا۔ اور جس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر میں باغوں اور سڑکوں پر گھومتا تھا، اور جو پنجاب ملک کے گیت گاتا تھا۔ اور بے تحاشا ہنستا تھا ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ انسان جو زندہ تھے، اس کے قریب کھڑے اسے دیکھ رہے تھے، مجھے اپنے جسم میں تیزی سے دوڑتے لہو کا احساس ہوا۔ میرے قریب اسد حمید، نسیم احمد گیلانی، امجد اور بہت سے لوگ آنکھوں پہ رومال رکھے سسکیاں دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں حسرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا، اور پھر گھر کی جانب چل دیا۔ دنیا میں غم کا نشان مٹ چکا تھا۔ میں شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ رات جب فاروق کو اندھیری قبر میں اُتار دیا گیا۔ میں اپنے پلنگ پر آنکھیں کھولے پڑا رہا، سرخ اندھیرا چاروں طرف بہہ رہا تھا۔

"میں فاروق ہوں، میں فاروق ہوں۔" وجود کی حدیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھیں۔ یہاں لاانتہا تنہائی تھی مگر تنہائی کا کوئی خوف، کوئی دکھ نہ تھا، خوف بھی مر چکا تھا۔ موت کا خوف بھی۔ اور اس کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ ایک مسلسل، ابدی انتہا سامنے پھیلی تھی۔

پھر میں اکثر شام کو باغِ جناح کی گیلی گھاس پر لیٹا رہتا۔ آسمان (سناٹے کا نیلا حول) مجھے چاروں طرف سے گھیرے تھا۔ اور اس کے نیچے پھیلی وسیع دنیا میں کہیں محسوس کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

اشرف ابا کے منشی کے لڑکے نے مجھ سے پوچھا۔

"فاروق آپ کا دوست تھا نا۔؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"کتنا خوبصورت تھا۔ میں نے اسے کرکٹ کے میچ میں دیکھا تھا۔ آپ۔ آپ زیادہ رنج نہ کریں۔ قدرت کو یہی منظور تھا، اور پھر انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ سوائے رونے کے"
وہ اپنے سرخ پھولدار رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔

"رنج کیا ہوتا ہے؟ فاروق مر گیا۔ مگر میں زندہ ہوں، تم زندہ ہو، اتنے بہت سے انسان زندہ ہیں۔ اور"

اشرف کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ اس نے اپنا سرخ رومال گھٹنوں پر رکھ کے تہہ کیا۔

"آپ کے دل پر دھما کا بیٹھ گیا ہے۔ زیادہ غم ہو تو آدمی پتھر ہو جاتا ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ یہاں بے حسی کو بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ سب بے حسی کا وجود تسلیم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ "آپ میرے ساتھ پیروں کے گھر چلیئے" جی ٹھیک ہو جائے گا۔" اشرف نے بڑے وثوق سے کہا۔

پھر اس نے مجھے بتایا کہ جب خورشید کی بات کہیں اور پکی ہونے لگی تھی تب وہ پیر صاحب کے پاس گیا تھا۔ اور انہوں نے میٹھے چنے دم کر کے دیئے تھے اور پانچ تعویذ جو اس نے خورشید کو دے دیئے تھے۔ اور پندرہ دن کے اندر اندر اس کی بات ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ ہر جمعرات وہاں سماع میں جاتا ہے، اور بے شمار بیمار لوگ وہاں آتے ہیں۔

تب میں اشرف کے ساتھ ان بیمار لوگوں کو وہاں دیکھنے گیا۔ ایک مستطیل کمرے میں لوگ جمع تھے۔ گھٹتی ہوئی گرم فضا میں اگربتیوں کی مہک اُڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب شاہ صاحب سفید کپڑوں پر ہری شال اوڑھے بیٹھے تھے۔ اور لوگ باہر صحن سے کھڑکی میں جُھک جُھک کر ان کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ اور اپنی کرب سے دہکتی آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ اور ان کے چہرے سُرخ انگارا سے تپ رہے تھے۔ پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ ان کے کانپتے ہونٹ شاہ صاحب کے ہاتھوں سے ایک سلگتی گرسنگی سے چپک جاتے۔ بے بس دُکھی انسانوں کا ہجوم، جو اپنی تمناؤں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ مگر ان کے

غم اور ان کی تمناؤں کی آنچ مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی راستوں میں وہ پتھر کی دیوار پڑی تھی۔
میں یاد کرتا رہا۔ تمنا کیسی ہوتی ہے؟

"تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔"

"ہا۔" شاہ صاحب کے پاؤں تھاپ کے ساتھ اُٹھنے لگے۔ ایک بیمار زرد رو لڑکا، جھوم جھوم کر دیوار کے ساتھ سر ٹکرا رہا تھا۔ میرے قریب بیٹھے سفید ریش آدمی کی سانس تیز تیز چلنے لگی، اس کی تپتی سُرخ آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔

"جھبدے آنویں وے جیبا نیئں میں مرگیا۔"

"ہا۔ نیئں تے میں مرگیا۔" اس کے قدم بھی شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ اُٹھنے لگے۔

اشرف دیوار کے ساتھ لگا چُپ چاپ کھڑا تھا۔ یکدم اس کا چہرہ بے حد زرد پڑ گیا۔ آنکھوں میں نیند سی اترنے لگی۔ وہ بمشکل اپنی پلکوں کو کھولے ہوئے تھا۔ گہری گہری سانسوں سے نیلی قمیض سے اس پسلیاں ابھری نظر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے تیزی سے دوڑ کر، شاہ صاحب کے سامنے سر جھکا دیا۔ شاہ صاحب نے اپنا فسوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا، موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں سے بہہ کر چٹائی میں جذب ہونے لگے۔ انسانوں کا ہجوم کسی انجانے لاوے کے تیز ریلے میں بہہ رہا تھا، سب سر ایک ہی تال پر جھوم رہے تھے۔

"دیوا بال کے مٹائے ہنیرے کلی دے وچوں یار لبھ لے۔"

لوگ بے بسی سے ہاتھ ہلا ہلا کے رو رہے تھے۔ احساس کی فراوانی دیواروں میں سرایت کر گئی۔ میرے گرد دیواریں سانس لے رہی تھیں۔ اور قدموں تلے زمین دھڑک رہی تھی۔ اشرف میرا ہاتھ پکڑ کے شاہ صاحب کے قریب لے گیا۔ انہوں نے اپنی نم آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔" اشرف نے کہا۔ شاہ صاحب نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

"اندھیری کوٹھری دیا نہ جلے؟" انہوں نے اپنی گہری آواز میں کہا۔ میں خاموشی

سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا،

"بولو!" اشرف نے میرا شانہ ہلایا۔ "سب کچھ کہہ دو۔"

"مگر کیا؟" میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ اس مستطیل کمرے اور کچے صحن سے باہر کائنات پر اسی جامد لمحے کا پردہ تنا تھا۔ سب انسان اجنبی تھے اور سب انسان آشنا تھے۔ واپسی پر میں نے اشرف سے کہنا چاہا۔ "حامد میرا بھائی جب روک ان رول موسیقی سنتا ہے تو اس کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے جو آج اس کمرے میں سب کی تھی مگر تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تم کو روک ان رول کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اور تم شاہ صاحب کے سامنے سر جھکا کے رو سکتے ہو۔ اور جب تم شاہ صاحب کے دم کئے ہوئے میٹھے چنے کھاتے ہو اور اپنی محبوبہ کو ان کے تعویذ دیتے ہو تو تیزی سے بڑھتے ہوئے المیے کا رُخ بدل جاتا ہے۔ تم محض اپنے اندر محدود رہ کر اسی لئے تم دکھی ہو سکتے ہو، پیار کر سکتے ہو!"

اس شام جب میں نے ماں کو بتایا کہ میں پیر دین کے گھر گیا تھا تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر اس جامد لمحے کی موت کے شدید انتظار میں میرا ذہن بالکل شل ہو گیا۔ چنانچہ وہ انتظار بھی مر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اپنے آپ کو یوں فراموش کر دینے میں بڑا سکون تھا۔ جیسے انسان کے جسم کا بوجھ ختم ہو جائے، ایک مکمل توازن جو اسے فضا میں معلق رکھے۔

معلوم نہیں کتنے دن میں اس سحر میں سانس لیتا رہا۔ شاید اسی دوران میں آپا اور ممی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں بہت بدل گیا ہوں اور مجھے ان کی بالکل کوئی پروا نہیں حالانکہ پہلے میں ان پر جان دیتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر وہ میرے سامنے بیٹھی روتی رہیں۔ مگر میں ان سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ روؤ نہیں۔ دراصل میں کسی چیز کو بھی چھو نہیں سکتا۔ کسی انجانی چیز کی دبیز تہہ میرے اور میرے لمس کے درمیان حائل ہے۔

اس آخری رات میں بہت دیر میں گھر لوٹا تھا۔ گھر کے سب لوگ صبح ہی سے

کسی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے دبی دبی سسکیوں کی آواز سُنائی دی، میں نے بتی جلائی اور ایک دہشت زدہ چیخ رات کی خاموشی کو چیر گئی۔ "آپا کا بٹیا ککو۔ ایک دم میرے ساتھ لپٹ گیا۔ اس کا تمام جسم تیز ہواؤں میں لرزتے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

" اجی۔ ماموں، " اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے پکارا۔" اجی ماموں۔ میں اکیلا رہ گیا۔ سب چلے گئے۔" اس نے میرے گرد اپنی کانپتی باہوں کی گرفت سخت کر دی۔ اس کی دھڑکتی پسلیاں میرے جسم میں چبھنے لگیں۔ تیزی سے بہنے والے آنسو میرے ہاتھوں پر انگاروں کی طرح گرنے لگے۔ تب میرا رواں رواں کسی جان لیوا آگ میں جل اُٹھا جیسے کسی نے اُبلتا لاوا ڈال کر مجھے ایک گہرے، سحر زدہ خواب سے جگا دیا ہو، میں نے انجانے ہی میں لہو ٹپکاتے احساس کو چھو لیا تھا، اور اس لمس کا زہر میرے تمام جسم میں گھُل گیا تھا۔

"ککو" میں نے جُھک کر اس کے سرد پاؤں پکڑ لیے۔ "ککو۔!"، تنہائی کا کھرا دکھ اور خوف میرے اندر سرایت کر گیا۔ آنسوؤں کی دھارا بہہ نکلی۔

موت کا وہ لمحہ مر چکا تھا، میں، ایک تنہا اور خوف زدہ انسان، ایک دوسرے تنہا، خوف زدہ انسان کے سینے کے ساتھ سر لگائے، سسکیاں بھر رہا تھا۔ اور تمام کائنات میں سائیں سائیں کرتی، تنہا رات بکھری تھی۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

"گُنگ شہزادی"

سچ پوچھیئے تو یہ قصّہ اس وقت شروع ہوا جب وہ سنسان دوپہروں میں، دالان کے پیچھے، اندھیری کوٹھڑی میں، کنجیوں کے گھنگھرو پاؤں میں پہنے، اماں کے دوپٹے کا گھگھرا بنائے، لپک لپک کر ناچتی تھی۔ دالان میں اماں سلائی کی مشین پر جھکی ہوتیں، پچ پچاپچ۔ ایسے میں ہر آواز اس کے رقص کے لیے تال بن جاتی اور نیچے سُرخ فرش والے کمرے میں، جس کے بیچوں بیچ کالا سیاہ دائرہ بنا تھا۔ اور اس دائرے میں سفید رنگ کی بڑی نوکیلی پتیاں کھنچی تھیں، گھوں گھوں چلتے پنکھے تلے، ابا اُجلے بستر پر سو رہے ہوتے، ایک ہاتھ سر تلے دھرے۔ ماتھے پر بھنوؤں کے درمیان سے لے کر سر کے بالوں تک نیلی سی رگ اُبھری ہوتی۔ روشندانوں اور کھڑکیوں پر سیاہ پردے تنے ہوتے۔ اور چاروں طرف ابا کے پسینے کی یکدم اُداس کر دینے والی مہک پھیلی ہوتی۔

اوپر گیلری میں بھیا چپچپاتی مٹی سے بوٹوں کے ڈبے کا کیمرہ بنا رہے ہوتے، اور مینو اور چھوٹے میں گھمسان کا رن پڑ رہا ہوتا——

"شاباشے کدو—— شاباشے۔" رحمت کھڑا مینو کو بڑھاوا دیئے جاتا۔

یہ بس کچھ انہی دنوں کی بات ہے کہ چیزوں نے آپس میں گڈمڈ ہونا شروع کیا۔ کبھی کبھی تو رنگوں، آوازوں اور بولتے اندھیروں کا ایسا ملغوبہ بنتا کہ اس کا سر چکرا کے رہ جاتا۔ سودی، شبو، اور کینز کے ساتھ گھر گھر کھیلتے کھیلتے یکدم

اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ چار پائیوں کی پائنتی پر بندھے، دو پٹوں کے پردوں والے، اچھے خاصے، سجے سجائے گھر میں، مہمانوں کی تواضع کرتے کرتے وہ گرمیوں کی لمبی چھٹیوں کے بعد کھلنے والے اسکول کے گیٹ پر کھڑی ہوتی۔ سامنے پھیلی وسیع گراؤنڈ میں کہیں اکا دکا لوگ پھر رہے ہوتے۔ ہائی جمپ کا، نرم نرم بالو والا چوکھٹا چمک رہا ہوتا ——— اور زرد زرد روئی کے گالوں ایسے پھول درختوں سے جھڑ جھڑ کے ہر طرف اڑ رہے ہوتے، ککُو ——— کو ——— کوئل کی ہوک ہر درخت سے اٹھتی ——— حوض میں نل سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا ہوتا ——— اور اس کے گلے میں پڑے بستے کے اندر گھر کے کام کی کاپی کے ورق بالکل سادہ ہوتے ———

"واہ ہم نہیں کھیلتے ——— وہ جو گولیاں لی تھیں ——— وہ تو نہ کھیں نہیں ہمارے آگے" سوسی منہ بسورتا ———

وہ بات کئے بغیر اپنی چیزیں سمیٹتی اور زینے کی طرف چل دیتی۔ اس وقت اس کے ہاتھ ایک جان لیوا پیاس میں جل رہے ہوتے۔ مشین پر جھکی اماں کی کمر سے لپٹ کر وہ اپنے پیاسے ہاتھ نرم نرم پیٹ میں گاڑ دیتی ——— ناف کا خوبصورت گڑھا اس کی انگلیوں تلے دھڑکنے لگتا اور ایک شیریں نشہ اس کی رگ رگ میں تیر جاتا۔

"ارے ہٹ ——— کام کرنے دے، کیا بوٹیاں نوچتی رہتی ہے ———"

اماں کسما کے کہتیں۔ نرم، ریشم ایسے پیٹ پر تیزی سے تیرتے ہاتھ دم بھر کو ساکت ہو جاتے۔ اماں بھی کچھ دیر کو سب کچھ بھول جاتیں ——— مگر پھر یکدم گھبرا کے اس کے سوکھے بازو اپنے جسم سے نوچنے لگتیں ———

"ارے ——— کیا آگ کی طرح تپتے ہیں ہاتھ۔ ہٹ ———"

وہ بھرے بھرے گلے کے ساتھ باہر گیلری میں چلی آتی، جہاں اب مینو، چھوٹا اور بھیا مل کر ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہوتے۔ ڈرامہ بنانے کا کام چھوٹے کے ذمے تھا جو بس پانچ دس منٹ میں زبردست

کلائمکس ڈرامہ تیار کر دیتا۔ بھیا تماشائی جمع کرنے پر مقرر تھے، جو ڈرامہ کئی کئی گھنٹے دیر میں شروع کراتے کیونکہ بھنگن حاکاں عین وقت پر اکڑ جاتی اور ڈرامہ دیکھنے سے انکار کر دیتی — اس کی منت سماجت میں خاصا وقت لگ جاتا۔ رہی وہ — تو اس کو ہمیشہ گونگی شہزادی کا پارٹ دیا جاتا۔ اور مینو کو بولنے کا۔ اور چھوٹا خود تین تین، چار چار رول ادا کرتا — مگر ہوتا یوں کہ پردہ اُٹھتے ہی اس کو بے تحاشا ہنسی آجاتی — پیٹ پکڑے وہ دوہری ہو ہو جاتی۔ چنانچہ پردہ پھر فوراً ہی گرایا جاتا۔ اور چھوٹے سے زناٹے کے تھپڑ کھا کے وہ منہ بسورتی باورچی خانے میں جا بیٹھتی — محفل برخاست ہو جاتی۔ اور باورچی خانے کے فرش پر کوئلے سے لکیریں کھینچتے ہوئے اسے چاروں طرف سے آپا کے پسینے کی اُداس کر دینے والی مہک آلیتی۔ حالانکہ آپا کبھی کے ٹینس کھیلنے کے لئے جا چکے ہوتے۔ مگر یہ مہک گھپ اندھیرا بن کر پھیلتی جاتی یہاں تک کہ سب کچھ اس میں ڈوب جاتا۔

"بیچو بیچ گنڈیریاں —" سودی گلی کے بچوں کے ساتھ چلاتا پھرتا۔ اس کا دل بیٹھ جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ سودی کے ساتھ اس کا کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی جب وہ اس سے الگ، دوسروں کے ساتھ کھیلتا تو اس کی آواز کی نحوست کے مارے اس کے کان پھٹ جاتے۔ وہ جنگلے پر جھک کر نیچے صحن کے اندھیرے کو گھورنے لگتی۔ پھر اُسے یکدم آپا کا خیال آتا جو شبر کی امی کے پاس گئی ہوتیں۔ شبر کی امی جن کے گول گورے چہرے کے گرد سیاہ بال پھیلے رہتے۔ اور جن کے سامنے کے دو دانت ذرا اُونچے اور بے حد چمکدار تھے۔ اور جو دن کا اکثر حصہ ہارمونیم بجاتی تھیں۔ اور ایک ہی گیت گاتی تھیں — (آئے بھی وہ — گئے بھی وہ —) آپا کے ساتھ وہ جانے دن بھر کیا کیا باتیں کرتیں — ہاں ایک فقرہ اس گیت کی طرح بار بار دہرایا جاتا۔ "مجھے صدیقی صاحب سے محبت نہیں۔ اُنس ہے۔ اور اُنس تو ایک کتے کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے!"

وہ اپنے پاؤں میں بیٹھے ریشم ایسے بالوں والے، چھوٹے سے سفید کتے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرکے کہتیں ـــــ اور وہ اکتا کر کارنس پر رکھی چینی کی رنگین گڑیوں اور گلدانوں کو دیکھنے لگتی۔ شبر گم سم اس کے پاس کھڑا رہتا۔ شبر کے ساتھ اس کی اس لئے بھی نہ بنتی تھی کہ وہ ہر وقت اپنے باوا جان کی باتیں کرتا تھا۔ چنانچہ وہ شبر، اس کی امی، اور آپا کو اس رنگین پردوں والے چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ کر، چپکے سے گھر کی طرف چل دیتی۔ گلی کی بتیاں جل چکی ہوتیں جیسے رات کے اندھیرے میں ناف کے بے شمار خوبصورت گڑھے دھڑک رہے ہوں۔

مگر زینہ چڑھتے ہی سگریٹ کی خوشبو، ماسٹر ناز کی سرمے بھری آنکھیں بن کر اس کو جکڑ لیتی۔ اسے جمع تفریق کے سوال یاد آجاتے جو اس سے کبھی حل نہ ہوتے تھے۔ اور زینے کے آدھ بیچ کھڑے کھڑے وہ بھول جاتی کہ وہ آبا کے سگریٹوں کی خوشبو ہے یا جمع تفریق کے سوال اور ماسٹر ناز کی تیز آنکھیں۔ چیزیں پانی کی طرح ایک دوسرے میں مل کر ایک ہوجاتیں۔

رات کو بستر میں اکیلے لیٹے وہ دم سادھے، اماں کا انتظار کرتی رہتی۔ آپا کی سہیلی رفو باجی کی سنائی ہوئی سانپوں اور مردوں کی تمام کہانیاں اس کی جلد پر چیونٹیاں بن کو سرسرانے لگتیں۔ بستر میں گھنٹوں ایک ہی کروٹ پڑے پڑے وہ پسینے میں بھیگ جاتی۔ بھیّا، مینو اور چھوٹا تکیوں سے لڑ رہے ہوتے اور ہاتھوں کے ہوائی جہاز بنائے دشمن کے علاقے پر بم گراتے اور پرکھلی چھت پر تاروں بھرا آسمان پھیلا ہوتا اور اس کے دل کی منحوس دھڑکن نقارے کی طرح گونج رہی ہوتی۔

مگر جب آدھے سوتے، آدھے جاگتے میں۔ اسے اپنے ساتھ اماں کا ریشمی جسم محسوس ہوتا تو وہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر کے رہ جاتی جیسے کوئی ہتھیلی کی گرد پھونک سے اڑا دے۔ سب کچھ ختم ہوجاتا۔ صرف وہ مخملیں گرمی۔ اور گھناؤنا، ازلی اندھیرے کی طرح آسمان سے لیکے زمین تک بہنے لگتا۔ اس کی ساری

جان کھینچ کر سوکھے ہاتھوں میں آجاتی ۔ گول مٹول خوبصورت سودی کی منحوس آواز ، اور ابا کی جادو بھری آنکھیں ۔ اور سلائی والی مس کی چڑھتی تیوری ، آپا کے خوبصورت کپڑے ، گولڈن قلم اور اونچی اونچی باتیں ۔ اسکول میں صبح صبح اپنی تختیوں پر زبردستی خوشخطی کروانے والی نور جہاں ، اور رفو باجی کی کہانیاں ، سب کچھ اس نشے میں بہہ جاتا ۔

مگر اس شام وہ رفو باجی سے اس لڑکی کا قصّہ سن کر آئی تھی جس کو بال بڑھانے کا بے حد شوق تھا ، اور کسی کے کہنے پر اس نے سانپ کے بل کی مٹی سے مہینہ بھر بال دھوئے تھے ۔ اور ایک روز وہ اپنی دوست کے ساتھ چلی جا رہی تھی کہ یکدم اس کی لمبی چٹیا بل کھاتی ، ساتھ چلتی سہیلی کی گردن سے لپٹ گئی ۔ چنانچہ آج پورے چاند کی روشنی میں ہر چیز بل کھاتی ۔ سرسراتی نظر آ رہی تھی ۔ یہاں تک کہ اماں کے گورے پیٹ پہ ہاتھ رکھے ، سوتے میں وہ آدھی رات کو کپکپا کر جاگ اٹھی ـــــ اس کی انگلیوں نے بے تابی سے دھڑکتے گڑھے کو ڈھونڈا ـــــ مگر یکدم اس کا ہاتھ پتھر ہو گیا ۔ وہ خالی چارپائی کی پٹی کو ٹٹول رہی تھی ۔ دم سادھے ، اس نے ہولے ہولے خالی جگہ کو ٹٹولنا شروع کیا ، اس کے حلق میں کانٹے ابھر آئے اور پلکیں سل گئیں ـــــ سرہانے رکھا اماں کا گجرا تیزی سے مہک رہا تھا ، کچھ تازہ کچھ باسی مہک ۔ اس کا خون رگوں میں جمنے لگا ۔ اندھیرے اسکول کے ویران باغوں میں چمگادڑیں اس کے سر پہ منڈلا رہی تھیں ۔ اور سب راستے پتھروں سے اٹے پڑے تھے ۔ اور دل کی منحوس دھڑکن کا نقارہ گونج رہا تھا ۔

صبح جب اماں نے اسی پیار کے ساتھ پراٹھا اس کے سامنے رکابی میں رکھا تو اس کی آنکھوں میں انگارا سے جلتے آنسو بھر آئے ۔ اور اس کے بعد وہ پھر کبھی اماں کو خشک آنکھوں سے نہ دیکھ سکی ، ہر بار پانی کی دھڑکتی دیوار اس کے اور اماں کے درمیان آجاتی ، اور اس کے ہاتھوں میں جیسے زہر بھرے کانٹے چبھ جاتے ۔

جب کچھ دنوں بعد ہی شبّر کی امّی، اُسے یہ چھوڑ، گود کے گڈّو کو لے، راتوں رات کہیں چل دیں تو وہ پہروں شبر کے ساتھ، دروازے کے باہر سیڑھیوں پر چپ چاپ بیٹھی رہی، اندر، شبر کی بہن شائستہ سفید ڈھیلا پاجامہ پہنے تمام گھر میں گھومتی پھر رہی تھی۔ اور آنے جانے والوں کو جھک جھک کر آداب کر رہی تھی اور صدیقی صاحب سر ہاتھوں میں تھامے صوفے پر بیٹھے تھے اور ریشم ایسے بالوں والا سفید کتا گھر کی دیواریں اور کونے سونگھتا پھر رہا تھا۔

پھر کئی روز تک اماں اور آنے جانے والیوں کے درمیان دبے دبے لہجے میں بیگم صدیقی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اور ابا صبح شام آئے بھی وہ گئے بھی وہ، گاتی پھیہ یں —— یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات خالی چارپائی کی پٹی ٹٹولتے ٹٹولتے وہ یکدم شبر بن گئی۔ خوف سے لرزتے ہوئے اس نے ہولے سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اور سن سے رہ گئی۔ چپٹی ناک کی بجائے اونچی سی نوکدار ناک، لمبی لمبی آنکھوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں —— اس کی انگلیاں شبر کی گوری رنگت میں بھیگ گئیں۔ اس کا دم رک گیا۔ یہاں تک کہ جب پچھلی رات کو اچانک اماں کا جسم اس سے چھوا تب بھی وہ پتھر بنی پڑی رہی۔ اور صبح دھوپ چڑھے تک نہ اٹھی۔ نیچے اماں ناشتے کے لئے چلا چلا کے تھک گئیں۔ آخر چھوٹا اسے جگانے کے لئے آیا۔ مگر ڈر کے مارے اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔ شبر کا چہرہ لئے بھلا وہ نیچے کیسے جاتی۔؟ تنگ آ کر چھوٹے نے اس کو بستر میں لپیٹنا شروع کیا۔ اور پھر اماں کی آواز آئی۔

"آپ آواز دیں جی ذرا ——" اور یکدم ابا کی آواز گونجی ——

"چھوٹی ——"

"آئی جی!" وہ لرز کے اٹھ بیٹھی۔ نئی، انجانی چیزیں اسے ہمیشہ اسی طرح جکڑ لیتی تھیں۔ ابا کی جادو بھری آنکھوں کی طرح ان کا لمبا اونچا قد، اور سفید کپڑے اور زردی مائل چمکتے دانت، اور سگرٹوں سے بھوری پڑی انگلیاں ——

سب کچھ اس کے ذہن میں انداز اً ہی محفوظ تھا، جیسے کوئی پہلی رات کا خواب۔
سیڑھیاں اُترتے ہی، سب سے پہلے وہ ڈرتے ڈرتے، دالان میں آئینے والی الماری کے سامنے گئی۔ سانولے چہرے پر چپٹی ناک، لمبی لمبی آنکھیں۔ بھورے بال اور سوکھی سوکھی ٹانگیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی، چیزیں جو پانی بن کر ایک دوسرے میں گھل گئی تھیں۔ ہولے ہولے اپنے خطوط کے ساتھ ابھرنے لگیں۔

مگر اس رات کے بعد سے سب کچھ بدلنے لگا۔ اماں کو چھو کر تو اس کے اندر اور بھی اندھی ویرانی پھیلنے لگتی۔ اب سودی اس سے کھیلنے آتا، تب بھی اس کا دل اندر ہی اندر کٹتا جاتا۔ اسکول میں ٹک شاپ سے دو پیسے والی کو کونٹ کھا کر اس کا جی بھاری ہو جاتا۔ اور سلائی والی مس اُسے تر پائی سکھا سکھا کے عاجز آ گئیں ــــ پھر لمبی سُنسان دو پہریں بھی یونہی گذرنے لگیں ــــ سنگار میز پہ کنجیوں کے بھرے بھرے گچھے پڑے رہتے۔ مگر وہ انہیں رسی میں پرو کر گھنگھرو نہ پہنتی۔ کوئی بڑا گہرا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا تھا اور وہ اس جھٹکے میں معلق کھڑی تھی۔

وہ شروع سردیوں کے دن تھے۔ انگریزی کی نئی مس نے "قلم" پر مضمون لکھنے کو کہا تھا۔ بارش ابھی ابھی تھمی تھی اور ہوا کے جھونکوں سے درختوں سے پانی کی بوندیں برآمدوں کی سیڑھیوں پر ٹپک رہی تھیں۔ ماسٹر ناز برابر والے کمرے میں جمع تفریق کے سوال حل کروا رہے تھے۔ اور وہ مضمون لکھ کر سامنے زینے کے ساتھ لگے لکڑی کے چکنے جنگلے سے سودی اور ڈاکٹر صاحب کی گول مٹول لڑکیوں کو پھسلتے دیکھ رہی تھی۔ آخر اکتا کر اس نے کاپی مس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ مس نے مسکرا کر کاپی پر نظریں جھکا دیں۔ اور ان کی لمبی بھری بھری، سانولی انگلیوں میں سرخ پنسل گھومنے لگی۔
"یہ کیا ہے؟" انہوں نے اپنے موتیوں ایسے دانتوں سے ہنس کر ایک لفظ کے نیچے سرخ لکیر کھینچی۔ اور اپنی سنہری آنکھیں اس کی طرف اٹھا دیں۔ اُسی

وقت دروازے سے بھیگی ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ ایک بھاپ سی گرم مہک اس سے لپٹ آئی ـــــ جیسے میٹھی نیند کی لہر۔ کاپی اُٹھا کر واپس جاتے ہوئے اس نے دیکھا، اجلی گردن پر ڈھیلے ڈھالے، بڑے سے جوڑے میں جانے کا ہے کی سفید سفید کلیوں کا گچھا لگا تھا۔ اس کے بعد تمام دن اسے یوں لگا جیسے وہ خواب میں چل پھر رہی ہو۔

اسکول چھٹنے پر، جہاں آرا نے اس کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے کہا۔

"رفعت آپا کتنی اچھی ہیں!"

"کون؟" اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"یہی۔ انگریزی کی نئی مس۔ ہماری آپا کی دوست ہیں۔ آتی ہیں ہمارے یہاں ـــــ"

اُسے گرم باس اور میٹھی نیند یاد آگئی ـــــ اور راتوں والی اندھی ویرانی اس کے اندر پھیلنے لگی۔ جیسے پیاسی زمین میں پانی کا ریلا جذب ہو جاتا جائے۔ گلی میں چلاتا سودے۔ چارپائی کی کھردری پٹی، ابا کی جادو بھری آنکھیں۔ کنجیوں کے بھرے بھرے گچھے ـــــ جانے وہ کیا کیا دیکھ سن رہی تھی۔ پھر سب کچھ پانی بن کر ایک ہو رہا تھا۔

اگلے روز کھیل کے گھنٹے میں مس بیٹرز کی بجائے رفعت آپا ہی گراؤنڈ میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے سفید ساری کا پلو کس کر کمر کے گرد باندھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے دائرہ بنوانے لگیں، گرم گرم ریشمی لہر اس کے ہاتھوں میں تیر گئی۔ اس نے گھبرا کے ہاتھ چھوڑ دیا ـــــ اور باؤلوں کی طرح مُنہ دیکھنے لگی ـــــ

"کیوں کیا بات ہے؟" انہوں نے جھک کر پوچھا ـــــ اور پھر ہنس کر دائرہ بنوانے لگیں۔ چست ساری سے ان کے جسم کی خوشبو بھری آنچ اٹھ رہی تھی۔ جیسے اس کے ہاتھ بے شمار، دھڑکتے، روشن گڈھوں پر تھرتھرا

رہے ہوں۔ کچھ لمحوں کے لئے وہ بالکل بھول گئی کہ وہ کہاں ہے۔
"گھومو ــــ تیزی سے" رفعت آپا نے کہا۔ اور دائرہ تیزی سے چکر کھانے لگا۔ ایک انجانی وحشت اس کے اندر کوند گئی اور وہ چکر کھاتے اس دائرے میں بے تحاشا دوڑنے لگی ــــ
اس روز گھر آکے وہ گھنٹوں اماں کے ہلکے ہلکے سیدھے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ جو بار بار کھل کر گر جاتا۔ یا پھر اس کے پتلے پتلے بلوں میں سے اماں کی گردن جھانکنے لگتی۔
"ارے ہٹ ــــ کیا بال نوچ ڈالے ہیں"۔ اماں کو آج بار بار سوئی میں تاگا پرونا پڑ رہا تھا اور وہ بار بار اس کے ہاتھ جھٹکے جا رہی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی بال کھول کھول کے لپیٹتی رہی، یہاں تک کہ اس کے کندھے اور بازو تھکا کے چور ہو گئے۔ اور آنکھوں میں ایک گھٹن بھر گئی۔ آخر وہ فرش پر اوندھے منہ گر کے رونے لگی۔
"ارے کیا دوپہر کے وقت فیل مچا رہی ہے۔ ابا جاگ جائیں گے ــــ میٹھی روٹی رکھی ہے ڈولی میں، کھا لے۔ فاقے کرے گی تو رونا ہی آئے گا نا ــــ"
اماں جھنجھلا کر بولیں۔ مگر وہ فرش کے ساتھ چمٹی آنسو بہاتی رہی۔
اب یہ کچھ اس کی نظر کا قصور تھا نہیں کہ روز نئی نئی چمکدار چیزیں سامنے آنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے ایسی گلابی رنگت کی نیل پالش کہاں دیکھی تھی۔ اماں تو عید کی عید مہندی لگاتی تھیں۔ اور اس کا پھیکا رنگ ناخنوں سے چھٹتا ہی نہ تھا۔ بس ناخنوں کے سرے پر، انگلیوں کے قریب سفید سفید چاند بڑھتے چلے جاتے۔ اور ابھی ناخن پوری طرح صاف نہ ہوتے کہ پھر عید آجاتی۔ مگر رفعت آپا کی سانولی انگلیاں تو جیسے روز ہی چمکتے گلاب میں ڈوب کر آتی تھیں۔ اور ہونٹوں پر بھی ویسا گلابی رنگ دِکھتا تھا۔
پھر ایک روز اس نے اپنی تمام چیزیں بیچ صحن میں رکھ کے بانٹ دیں۔

سوڈسی، تاج، شبّر، سب کے سب ندیدوں کی طرح بلور کی گولیوں، املی کے چینوں اور ٹافیوں کی پیتوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ بڑے مزے سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہی جیسے کسی اور کی چیزیں لوٹی جا رہی ہوں۔

"پھر روئے گی بیٹھ کر۔۔۔ کیوں بانٹ رہی ہے؟" اماں نے باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے پکارا۔ مینو اس کی گڑیا کا فٹ بال بنائے تمام صحن میں ناچتا پھر رہا تھا۔۔۔ مگر وہ بڑی بے نیازی سے جنگلے پر کھڑی آئے بھی وہ گئے بھی وہ۔ الاپتی رہی۔ اور پھر رات گئے تک اماں سے ساری پہننے کی منتیں کرتی رہی۔

"ارے نہیں ہے میرے پاس ساری، کہہ جو دیا۔۔۔ چل۔۔۔" اماں نے دستِ پناہ زمین پر ٹخ کر اسے دھمکایا۔ اور وہ جو ہے ہری لکیروں والی۔۔۔ جو تصویر میں نہیں ہے۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے پہن لیں۔۔۔" وہ باورچی خانے کے فرش پر لوٹنے لگی۔

"اسے بلائیے جی ذرا۔۔۔" اماں نے پکارا۔۔۔ اور پھر دالان میں سے ابا کی ہوک اٹھی۔

"چھوٹی، چل ادھر آ۔۔۔ رپورٹ آئی ہے تیری اسکول سے۔ ادھر تو آ ذرا۔ ہیں۔۔۔"

وہ لرز کر اٹھ بیٹھی۔ پیلے کاغذ پر ماسٹر ناز نے جانے کیا کیا لکھا تھا۔ سرخ پنسل سے۔۔۔ اور اسی رات ابا نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی نالائق ہے کہ اماں کے ساتھ سونے کے قابل نہیں۔ لہٰذا اس کی الگ کھٹولی ڈال دی گئی اور صبح جب وہ اٹھی اس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے کسی نے مرچیں بھر دی ہوں۔۔۔

اسی روز وہ یونہی اسکول کے گیٹ پر گلاب کی کیاری کے قریب رک گئی جہاں آرا۔۔۔ اور بلّی اور پروین، جانے کس کس کے لئے، رنگین تاگوں میں بندھے پھول لایا کرتی تھیں۔۔۔ اپنے گھر میں تو پھول کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کہیں گھاس کی پتی تک نہ تھی۔۔۔ اماں کے بستر میں جانے رات کو کہاں سے چنبیلی کے گجرے آجاتے۔

اس نے کئی بار سوچا، صبح کو چپکے سے بستے میں ڈال کر چل دے۔ مگر صبح تک وہ پیلے بھی پڑ جاتے تھے۔ یوں بھی اماں باسی گجرا، صبح صبح گھڑے پر ڈالنے سے کبھی نہ چوکتیں۔ اس وقت اس نے بیبل کی اوٹ میں ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور چپکے سے دو بھرے بھرے گلاب توڑ کر بستے میں ڈال لئے۔

"کس کے لئے ہیں پھول؟" جہاں آرا بھوت کی طرح اسکے سامنے کھڑی تھی۔

"ہیں؟ ـــ نہیں۔ کسی کے لئے بھی نہیں ـــ کتاب میں رکھیں گے ـــ" اس نے اچھلتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور آگے بڑھ کے حوض کے نل سے پانی پینے لگی۔ پھر اس نے کنکھیوں سے برآمدوں کو ٹٹولا، مگر سب برآمدے خالی پڑے تھے۔ اور ماسٹر ناز ہمیشہ کی طرح، بڑے برآمدے کی دیوار میں لگے بلیک بورڈ پر اپنا کوئی شعر لکھ رہے تھے اور بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے باریک باریک مونچھوں کو ہموار کرتے جاتے تھے۔

"ککو ـــ کو" سیڑھیوں کے پہلو والے کمرے سے، سودی نے اُسے دیکھ کر، آواز نکالی ـــ وہ تیزی سے کلیاں کرنے لگی۔ پھر ٹن ٹن ٹن ـــ گھنٹی بج اٹھی ـــ سب لوگ گراؤنڈ میں جمع ہونے لگے۔ اس نے اپنی قطار میں کھڑے کھڑے روز کی طرح استادوں کے جمگھٹے کو گھورا ـــ اور پھر تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

دُعا کے بعد لمبی لمبی قطاریں اپنے اپنے کمروں کی طرف رینگنے لگیں۔ باتوں کا ہلکا ہلکا شور پھیلنے لگا۔ چاک اور روشنائی کی بُو اڑنے لگی اور ماسٹر ناز نے بلیک بورڈ پر جمع تفریق کی لمبی سی عبارت لکھی ـــ

"رفعت آپا گئیں نا ـــ"، جہاں آرا نے سلیٹ کو تھوک سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہیں ـــ؟"

"پشاور ـــ کل آپا سے ملنے آئی تھیں ـــ" جہاں آرا سلیٹ پر جھک گئی اور بڑی محنت سے سوال کی عبارت نقل کرنے لگی۔

اس روز جب وہ گھر پہنچی ـــ ڈرامے کے لئے، چارپائیوں سے نیا اسٹیج

تیار تھا۔ ہرے پلنگ پوش کا پردہ لٹک رہا تھا۔ اور چھوٹا بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"چل جلدی کر۔۔۔ بس پندرہ منٹ ہیں۔۔۔"

"اور ریہرسل؟" اس نے جیسے کسی اندھے کنویں میں سے پوچھا۔۔۔

"ارے ریہرسل کیسی؟ تو تو گونگی شہزادی ہے۔ بس چپکے سے بیٹھی رہنا۔ سب کچھ خود ہی ہوتا رہے گا۔"

اس روز پہلی بار، وہ پردہ اُلٹنے پر ہنسی کے مارے دوہری نہ ہوئی۔۔۔ اور بعد میں چھوٹے نے اُس کی اداکاری سے خوش ہو کر اُسے ایڑی تلے چمکایا ہوا پیسہ دیا۔ کیونکہ آج ہاؤس فل گیا تھا۔ اماں، ابا سے لے کر، سودیؔ، شائستہ اور شبرؔ تک سبھی موجود تھے یہاں تک کہ صدیقیؔ صاحب کا ریشم ایسے بالوں والا سفید کتا بھی!

شہرِ پناہ

اب جو کچھ دنوں سے اُسے ایک نیا روگ لگ گیا تھا۔ اس کی بھلا کسی کو کیا خبر ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس کا ذہن اتنی وضاحت کے ساتھ سوچنے کے قابل بھی کب رہا تھا کہ وہ اس پل پل بڑھتے اندھیرے کو الفاظ میں محسوس کر سکتی۔ (سوچ کا تسلسل تو خیر بڑی چیز تھی!) سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جب وہ گھپ اندھیرا اُبھرتا تو ایک لمحے تک کی مہلت نہ دیتا۔ ایک جھپاکے میں سب کچھ اس اندھے غار میں گر جاتا۔ اندھیرا اس کے کانوں، اس کی آنکھوں میں اٹک جاتا، یہاں تک کہ سانس کے ساتھ وہ کالک اس کے اندر اُترتی جاتی۔

بات کہاں سے اور کب شروع ہوئی تھی، اس کا فیصلہ بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ (اُس کے لئے چیزیں بغیر کسی آغاز کے شروع ہوتی تھیں) اب مثلاً وہ اگر اس بات کا کھوج لگانے لگتی کہ وہ کب سے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کیا کرتی ہے تو بات چلتے کہاں سے کہاں نکل جاتی۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تو واقعات کی کڑیاں ملانے میں وقت بہت اچھا گذرتا تھا مگر اب میں اس ذہنی سفر کی قطعاً سکت نہ رہی تھی۔ دراصل اس کے پاس یہی ایک قدم بھر زمین تھی۔ (وہی ایک قدم جواب موجود تھا) اس کے علاوہ آگے اور پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔

پھر یہ کچھ واقعات ہی کا مسئلہ نہ تھا، بہت سے انسانوں کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ انسان جو اس کے گرد اگرد بڑے اطمینان سے بیٹھے مسکرایا کرتے تھے، گھر اور دفتر کے کام کاج میں مصروف ہوتے تھے اور چلتے پھرتے تھے۔ جو اس چیز سے قطعاً واقف نہ تھے کہ دراصل وہ جو کچھ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ دوسروں کو ویسے نظر نہیں آتے۔ مثلاً، امی، اچھو، صفیہ باجی، گڈو، اباجی، اور ان کے علاوہ (کہ یہ ایک قسم کے لوگ تھے۔) انسانوں کی دوسری قسم تھی: مالی، بوٹا، غلام حسین اور بجو بیگم، اور انسانوں کی تیسری قسم یعنی ظفر اور محض ظفر1) ان سب کو معلوم نہ تھا کہ دراصل انہوں نے اپنے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دراصل اس وقت اپنے آپ کو دیکھ پائیں گے۔ جب دیکھنے والی اور دیکھی جانے والی آنکھ ایک ہو جائے گی۔

مگر یہ بھی کوئی اتنا بڑا حادثہ نہ تھا۔ اگر لوگ اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے تھے تو نہ سہی۔ اس کے ذہن میں تو بہر حال سب کے سب شطرنج کے مہروں کی طرح اپنی اپنی جگہ سجے بجائے کھڑے تھے۔ اب اگر صفیہ باجی اسے درختوں پر چڑھنے اور اچھو کی سائیکل چلانے سے منع کرتیں اور آئے دن اباجی سے اس کی شکایتیں کیا کرتیں تو اس سے بھی صفیہ باجی اور اباجی اس کے ذہن میں بچھی بساط میں اپنے اپنے مقام سے ذرا بھی تو نہ سرکتے۔ اور ان کو یوں پوری طرح سے دیکھ سکنے سے اس کو بڑا سکون ملتا۔ صفیہ باجی میں اس تمام گھٹیا پن کے باوجود ایک دل کش گرمی تھی جس سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ (اب مثلاً یہ پیار کا مسئلہ بھی پہاڑ بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جو انسان شدت سے اچھا لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر دکھ سا کیوں ہوتا ہے؟ دل ڈوبنے کیوں لگتا ہے؟) اور اباجی باوجود یہ کہ آدھی آدھی رات کو دبے پاؤں آکر دروازے پر دستک دیا کرتے اسے سردیوں کی راتوں میں گرم بستر چھوڑ کر دروازہ کھولنا ہی پڑتا۔ سب سے بڑھ کر وہ شام ڈھلے سے آدھی رات کی اذیت برداشت کرنا پڑتی تھی۔

جب تمام گھر پر ایک خاموشی بے بسی جھک آتی تھی۔ صداؤں کا سحر گہرا ہو جاتا تھا۔ شہتوت کے پتوں میں حادثے سرسرانے لگتے تھے۔ امّی مغرب کی نماز کے بعد چوکی پر بیٹھی تسبیح پھیرتیں۔ اور گڈو رحل پر سیپارہ رکھے کل کے کھلونے کی طرح آگے پیچھے جھولتی سبق پڑھتی جاتی۔ برآمدے کی زرد بتی ہولے ہولے جھپکتی رہتی سفید دیوار پر بتی کے قریب چھپکلیاں کیڑوں کو لپکتیں۔ موٹی موٹی، پھولے پھولے پیٹوں والی زرد چھپکلیاں جو کبھی کبھی دھپ سے زمین پر آن گرتیں اور لمحہ بھر کو ساکت رہنے کے بعد تیزی سے دیوار کی طرف بڑھ جاتیں۔ پھر رات کے کھانے کے بعد ایک ایک کر کے بتیاں بجھنے لگتیں۔ سڑک خاموش ہونے لگتی۔ گلاب دار ریوڑیاں، کی صدا دور دور تک دیواروں سے ٹکرا کے ڈوب جاتی۔ ہر آہٹ پر دل کی دھڑکن رک سی جاتی۔ باہر گلی سے کوئی گزرتا تو اسے یوں لگتا جیسے اباجی کے قدموں کی آواز کہیں اس کے دل سے ہی اٹھ رہی ہو۔ مگر اُسے معلوم ہوتا کہ ابھی ان کے آنے کا وقت نہیں۔ صفیہ باجی کے کمرے سے آنے والی ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز بھی بند ہو جاتی۔ پھر چھت پر دھما دھم کتے کودنے لگتے اور یوں لگتا جیسے چور دیوار پھاند رہے ہوں۔ اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ مگر اس کیفیت سے دہشت آتی تھی جب کوئی اچانک حادثہ اس کے سامنے لہو کی دیوار بن کر آن کھڑا ہوگا۔ صفیہ باجی نے اس کو اندھیرے اور کتوں سے ڈرتے دیکھ کر ایک بار بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا تھا:

"تجھے جان اتنی پیاری کیوں ہے؟"

اُسے خود بھی احساس تھا کہ جان کا اتنا عزیز رکھنا بڑی گھٹیا سی بات ہے، مگر حقیقت یہ تھی کہ اسے جان اتنی پیاری نہ تھی۔ دراصل اُسے منظر خوف زدہ کرتے تھے، حادثے نہیں۔ کیونکہ منظر تو وجود پانے سے پہلے ہی اس کے ذہن میں موجود ہوتے اور اُسے معلوم ہوتا کہ جب وہ باہر کی دنیا میں سامنے آن کھڑے ہوں گے تو کتنے بھیانک ہوں گے۔

بہر حال — یہ مناظر اور حادثوں کی بات ہی بڑی اُلجھی سی تھی۔ (مثلاً یہ کہ آخر منظر خود حادثے سے کس حد تک الگ ہے؟) چنانچہ چھت پر قدموں کی دھمک، گلی سے گزرتی موٹروں کی آواز اور ان سب کو لپیٹتا ہوا کسی حادثے کا انتظار یہ سب کچھ آدھی رات تک اسے جگائے رکھتا۔ (اندھیرے کے اس تسلسل کو گھنٹوں کے گجر کاٹتے چلے جاتے) ذہن میں اباجی کو پیش آسکنے والے بے شمار حادثے اُبھر اُبھر کر ڈوبتے رہتے اور پھر سب سے زیادہ فکر تو اُسے ہی ہوتی کہ وہ سلامتی کے ساتھ اپنے کمرے تک پہنچ جائیں۔ جب دروازے پر دھپ دھپ بھاری دستک ہوتی اور ڈوبے ڈوبے سروں میں گنگنانے کی صدا آتی تو وہ جھپٹ کر دروازے کی کنڈی کھول دیتی۔ ایسے میں وہ اباجی کی طرف دیکھتی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کوشش کے باوجود ان سے نفرت نہ کر سکے گی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیتے اور وہ اس وقت تک دم سادھے سنتی رہتی جب تک ان کے بھاری بوٹوں کے فرش پر گرنے کی آواز نہ آتی اور، لرز رہے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر، کی صدا ختم نہ ہوجاتی۔ (اس حالت میں بھی اباجی ایسے مشکل شعر گایا کرتے تھے!! اس کی اس کو آج تک سمجھ نہ آئی تھی) امی اونچی آوازیں کلمہ پڑھتیں۔ پھر سکون چھا جاتا۔ خراٹوں کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ ایک سیاہ پہاڑ اس کے سینے سے ٹل جاتا۔ اب؟ وہ اپنے خالی خالی ذہن کے گھُپ اندھیرے میں بڑے اطمینان سے جھانکتی۔

امی جلنی چپ تھیں اتنی ہی گہری۔ اور اس گہرائی کے خیال سے اُسے بڑا خوف آتا تھا۔ وہ، جو دن بھر کپڑے دھو دھو کر الگنی پر پھیلایا کرتیں اور ٹوٹے چولہوں کی مرمت کرتی رہتیں اور مشین پر جھکی کپڑے سیتی رہتیں۔ دراصل وہاں نہیں ہوتی تھیں۔ دفتر سے آنے کے بعد اباجی جھکی جھکی نظروں کے ساتھ ان کے قریب فرش پر بیٹھے رہتے اور دونوں آپس میں کوئی بات نہ کرتے۔ وہ اچھو اور صفیہ باجی کے ساتھ بھاری جی لئے تاش کھیلتی رہتی۔ اس اٹل

منظر سے اس کے اندر درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتیں۔ اس کا جی چاہتا وہ چیخ چیخ کے سب سے کہے:

"بولو۔ تم بولتے کیوں نہیں؟" مگر ظاہر ہے کہ خاموشی اس منظر کی بنت تھی۔ اور جب ابا جی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور لیمپ جلا کر موٹی موٹی کتابیں کھول بیٹھتے امی باورچی خانے کا رُخ کرتیں۔ وہ دھیرے دھیرے ادھ سلے کپڑے تہہ کر کے ٹوکری میں رکھتی اور بچی ہوئی کترنوں کو خاکی رنگ کی پوٹلی میں ڈال کر مشین کے اوپر ڈھکنا رکھ دیتی۔ وہ شروع سے اسی طرح کترنیں سمیٹتی چلی آئی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد جب وہ سیاہ طلسم گھر میں بھرنے لگتا۔ امی پلنگ پر لیٹی تسبیح گھمانے لگتیں، اچھو سائیکل لے کر باہر نکل جاتا۔ تب اس کی آنکھوں میں تحفظ کا وہ نشہ اُترنے لگتا۔ اس تمام دکھ اور محرومی اور خوف میں بڑا امن تھا۔ وہ چپکے سے جا کر امی کے ساتھ لپٹ جاتی۔ ان کے جسم کی گرمی میں شہد کی سی مٹھاس ہوتی اور مٹھاس اسے بڑی بھاتی تھی۔ جب اس مٹھاس کی شدت سے اسے اپنا دل پھٹتا محسوس ہوتا تو وہ جھک کر امی کے پاؤں چومنے لگتی اور آنسو آپی آپ گر کے ان ستھرے پاؤں کو بھگونے لگتے۔ ایسے میں امی لرز جاتیں اور فوراً اٹھ کر اس کے سر کو سینے سے لگاتیں۔

"یا خدا تو نے مجھے کن دیوانوں میں لا ڈالا ہے"۔ وہ روتے ہوئے کہتیں۔ ابا جی بھی اسی طرح ان کے پاؤں کو آنسوؤں سے بھگویا کرتے تھے۔ یہ بات بھی بالکل پکی تھی۔

علاوہ ان آنسوؤں کے، اور جسم کی شہد ایسی مٹھاس کے باقی سب کچھ ثانوی تھا۔ اگر وہ دن بھر وحشیوں کی طرح غلام حسین (ابا کے چپراسی) یا پھر اچھو کی سائیکل چلاتی اور درختوں پر چڑھ چڑھ کے بجو بیگم (غلام حسین کی بیٹی) کی جھولی میں پکی پکی رس بھری جامنیں گرایا کرتی یا اپنے دوپٹے کا فٹ بال بنا کر اچھالتی پھرتی

اور صفیہ باجی اسے گالیوں پہ گالیاں دیے جاتیں تو یہ سب کچھ قطعاً اہم نہ تھا۔
ایک روز اس نے صفیہ باجی کی ڈانٹ کے باوجود اچھو کے دوست ظفر کے ساتھ سائیکل کی ریس لگائی اور بیڈمنٹن کھیلی اور دونوں میں ہار کر بھی اس کے اندر ابلتی ہوئی وحشی خوشی مدھم نہ پڑی۔ وہ بے تحاشا ہنستی رہی اور ظفر اپنے جیتنے پر جھنجھلا سا گیا۔ تب اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ظفر کو سمجھانا چاہا کہ دراصل وہ بے حد محفوظ ہے اور اسے ہرایا نہیں جا سکتا۔ لوگ اس کو حیران نہیں کر سکتے کہ وہ لوگوں کو خوب اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ اگر کوئی چیز اسے حیران کر سکتی ہے تو محض اس کا اپنا وجود۔ مگر ظفر اس کے الجھے الجھے الفاظ سے زیادہ جھنجھلا گیا اور اپنی انگلیوں کو بھینچ کر خاموش رہ گیا۔ (شاید اس کو بھی الفاظ کا مسئلہ درپیش تھا) چنانچہ وہ پلٹ کر اچھو کے ساتھ انگریزی کی نئی فلم پر بحث کرنے لگا۔ مگر بحث کے دوران میں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بار بار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ وہ اپنی ہنسی دباتی جامن کے تنے کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔
جاتے ہوئے جب ظفر نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یونہی کچھ وہم سا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔
اتنے بہت سے دن ظفر کو دیکھتے رہنے کے بعد اسے احساس ہونے لگا کہ وہ انسانوں کی تیسری قسم ہے۔ ان سب انسانوں سے مختلف جن کو وہ اب تک دیکھتی آئی ہے۔ شاید وہ یہ جانتا تھا کہ دراصل وہ کیا ہے (دیکھنے والی آنکھ اور دیکھی جانے والی آنکھ کے ملاپ کے تصور سے اس کا دل لرز گیا) خوف زدہ ہو کر اس نے سوچا کہ اب وہ ظفر پر ہنس نہ سکے گی۔
اچھو اور ظفر، دونوں، چرا چرا کے ابا جی کی کتابیں پڑھتے۔ اچھو کے کمرے میں کاغذوں کے ڈھیر لگے ہوتے اور ظفر پڑھتے ہوئے کتاب پر پنسل سے ہلکے ہلکے نشان بھی لگایا کرتا اور کبھی کبھی کوئی فقرہ اپنی نیلی نوٹ بک میں لکھ بھی لیتا۔ اسے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چند ایک کتابیں، جو اس نے اسکول

کی لائبریری سے لے کر پڑھی تھیں۔ اسے انتہا سے زیادہ جھوٹی محسوس ہوئی تھیں۔ الفاظ پریوں بھی اس کا ایمان نہ تھا اور اب تو ہر وقت لوگ اسے میٹرک کے امتحان سے ڈراتے رہتے تھے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ ایک آدھ بار چیز دیکھ کر بھی وہ اچھے خاصے پرچے کر سکتی ہے چنانچہ وہ زیادہ تر وقت لوگوں کے دیکھنے میں صرف کرتی۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی جب ظفر دن دن بھر اچھو کے پاس بیٹھا رہتا تھا اور صفیہ باجی اسے لڑکوں کے سامنے اچھلنے کودنے پر بے تحاشا ٹوکنے لگی تھیں کہ اسے کسی آنے والے لمحے کے خوف نے بُری طرح گھیرنا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو دیکھ سکنے کی بے نام خلش اس کے ذہن میں واضح طور پر ابھر آئی۔ اس کو یقین سا ہو گیا کہ جب وہ کسی روز آئینے کے سامنے رکے گی تو ایک کی بجائے اس کے دو وجود ساتھ ساتھ کھڑے نظر آئیں گے۔ یا یہ کہ چلتے چلتے کسی روز وہ اپنے آپ سے ٹکرا جائے گی۔ اور اسے خود اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا ہوگا۔ (دیکھنے والی آنکھ اور دیکھی جانے والی آنکھ کا ملاپ ہوگا) یہاں حادثہ بذاتِ خود اہمیت نہ رکھتا تھا کہ اسے معلوم تھا۔ کہ دراصل یوں نہ ہوگا۔ مگر منظر تو موجود تھا۔ اور منظر ہی دراصل اہم تھا۔

امتحان کے بعد کی طویل چھٹیوں میں یہ منظر گہرا ہوتا گیا۔ بالآخر اس نے امّی سے کہا: "اگر چلتے چلتے کسی روز آپ اپنے آپ سے ٹکرا جائیں، اپنے آپ کو سامنے دیکھ لیں، وہ کچھ دیکھ لیں جو آج تک نہیں دیکھا تو پھر؟" "یا خدا تو نے مجھے کن دیوانوں میں لا ڈالا ہے؟" امّی نے لرز کے کہا تھا۔ اس روز اسے پہلی بار یوں لگا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا کے بھر بھرے کنارے پر کھڑی امی سے بات کر رہی ہو اور یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے فوراً اس کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مگر اسی شام ظفر نے اس سے بڑی کٹھور بات کہی۔

اس وقت وہ کھانے کے بعد چھالیہ اور الائچیاں لے کر اچھو کے کمرے میں گئی تھی۔ ظفر اور اچھو، دونوں، موٹی موٹی کتابوں پر جھکے تھے۔ ظفر بڑے

موٹے سے سیاہ فریم کی عینک لگاتا تھا اور اپنی عمر سے بہت بڑا دکھائی دیتا تھا اور اس پر بھی جب اکثر بچوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو وہ بڑی محظوظ ہوتی۔ مگر اب اسے اس سے بات کرتے ہوئے خوف سا آنے لگا تھا۔ دراصل وہ بہت کچھ جانتا تھا، یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

اس نے الائچیوں اور چھالیا کی تھالی کھڑکی میں رکھ دی۔ اچھو ڈکشنری لینے ابا جی کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ بے فکری سے گنگناتے ہوئے لوٹنے کو تھی کہ ظفر نے بڑی سختی سے کہا:

"کیا واقعی میں اتنا مضحکہ خیز ہوں تسنیم؟"

"کیا؟" اس نے جنگلیوں کی طرح منہ پھاڑ کے کہا۔

"اپنے آپ کو اتنا محفوظ مت سمجھو۔ دراصل کوئی بھی محفوظ نہیں نہیں ہے۔ سب اندھیرے کے گول چکنے گنبد سے ننگے پاؤں پھسل رہے ہیں۔" اس نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ اونچی سی ناک اور جلتی ہوئی آنکھوں پر گھنی سیاہ بھویں آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔

"تم کبھی یوں کسی بلندی سے پھسلی ہو؟ میں ایک بار بڑی چکنی دیوار سے پھسلا تھا۔ میرے ہاتھ سہارا لینے کو پھیلتے رہے مگر ایک جگہ بھی اٹکاؤ نہ تھا۔" اسے یوں لگا جیسے جس ٹھوس زمین پر وہ کھڑی تھی وہ ریت بن کر اڑی جا رہی ہو۔ اچھو ڈکشنری لے کر آگیا اور ظفر پھر کتاب پر جھک گیا۔

اُسے ظفر سے وحشت ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس وحشت نے بڑھ کر ہر چیز کو نگل لیا۔ آوازوں کا سحر ختم ہونے لگا۔ اب چھت پر قدموں کی دھم دھم نہ ہوتی، گلی سونی ہو چکی تھی۔ گلاب دار ریوڑیوں کی صدا بے معنی ہو چکی تھی (دراصل صداؤں کا مفہوم مر چکا تھا۔) اب کسی آہٹ پر اس کے دل کی دھڑکن نہ رکتی۔ رات گئے تک وہ ذہن کے خالی، تاریک اور چکنے کنوئیں کی دیواروں میں ناخن پھنسا پھنسا کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہتی۔ جب دروازے پر وہ بھاری سی

دستک ہوتی تو اس کے سینے سے سیاہ بوجھ نہ ہٹتا۔ وہ کچھ لمحے اس صدا کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی، پھر کل کے کھلونے کی طرح اٹھ کر دروازہ کھول دیتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ابا جی کے چہرے کو دیکھ پائے، مگر اکتاہٹ اور تھکن کے مارے وہ آنکھ تک نہ اُٹھاتی۔ ان کے جانے کے بعد وہ بھاری بوٹوں کے فرش پر گرنے کا انتظار نہ کرتی۔ امی کے کلمہ پڑھنے کی صدا اب اس تک نہ آتی۔ اس کے احساس کے گرد ایک دھند پھیلنے لگی تھی۔

اچھو اور ظفر کے ساتھ اس کے کھیل ختم ہو چکے تھے۔ فضا میں چاروں طرف ہر دم مٹی ہی مٹی اڑتی رہتی۔ اُسے اپنا آپ بھی ایک مٹیالی اینٹ محسوس ہونے لگا تھا۔ اکثر اسے یوں لگتا جیسے وہ ظفر کے سامنے جا کر چلانے لگے گی اور معلوم نہیں اُسے کیا کچھ سُنا ڈالے گی۔ دن رات کچھ اس کے اندر غراتا رہتا۔ کوئی خوفناک درندہ لمبے لمبے دانت اور نوکیلے پنجے لئے اس کے اندر سانس لے رہا تھا۔ وہ گھنٹوں سائیکل پر چکر لگاتی، تمام کمروں کی صفائی کرتی، بھاری بھاری بستر تک دُھو ڈالتی قالین جھاڑتی، پانی کے ڈول بھر بھر کر غسل خانوں کے حماموں میں ڈالتی، یہاں تک کہ تھکن کے مارے اس کا تمام جسم دُکھنے لگتا، مگر پھر بھی ایک بے پناہ، تاریک قوت اس کے اندر لاوے کی طرح اُبلتی رہتی۔ ایک انوکھا منظر اس کے اندر جنم لے رہا تھا۔ اس کی ایک اور ذات سایے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، مگر جس دم وہ پلٹ کر اس کی سمت دیکھتی وہ فوراً اُس کے اندر گھل جاتی۔ جاگتے میں بھی اب اُسے نیند کا احساس ہونے لگا۔ ہر چیز ہولے ہولے سرک کر نیلے آسمان میں جذب ہو رہی تھی۔

وہ آخر محرم کے دن تھے۔ پڑوسیوں کے ہاں سے رات گئے تک ماتم کی آواز آتی تھی۔

(آج شبّیر پہ کیا عالم تنہائی ہے!) وہ صحن میں بستر پر لیٹی دیواروں پر اُترتی تاریکی کو دیکھ رہی تھی۔ صحن کی اُونچی اُونچی دیواروں پر پھیلا آسمان

بہت اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے امی کی طرف دیکھا:
برآمدے کی زرد روشنی میں ان کا چہرہ بڑا اجنبی نظر آرہا تھا۔ وہ ہاتھ میں تسبیح گھماتی سیدھی لیٹی چھت کو تک رہی تھی اور موٹے موٹے آنسو کنپٹیوں سے بہہ بہہ کر تکیے میں جذب جذب ہورہے تھے۔ وہ کل کے کھلونے کی طرح اُٹھ بیٹھی۔ اس نے چاہا وہ جا کر ان کے ستھرے پاؤں پر جھک جائے۔ مگر ظفر اس کی آنکھوں سے چپکا چپ چاپ کھڑا تھا۔ تم محفوظ نہیں ہو، اس کی خاموش آنکھیں پکار کے کہہ رہی تھیں۔ وہ خاموش بیٹھی آسمان پر لرزتے تاروں کو دیکھتی رہی۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے! نوحے دیواروں سے ٹکراتے رہے۔
اب جو یہ نیا روگ اسے لگا تھا اس کی بھلا کسی کو کیا خبر ہوسکتی تھی۔ تخریب کے خوفناک سایے اس کے گرد ناچ رہے تھے۔ اب جب موٹی موٹی چھپکلیاں دیواروں سے دھپ دھپ گرتیں تو اس کے جسم میں جھرجھری نہ اُٹھتی۔ وہ چھپکلی کے وجود میں سرسراتی چوٹ کے احساس کو اپنے اندر سرایت کرتا محسوس کرتی۔ اب اکثر اس کا جی چاہتا کہ جب رات ابا جی دروازے پر دستک دیں تو وہ دروازے کی کنڈی نہ کھولے اور وہ صبح تک اسی طرح دروازے کی سیڑھیوں میں پڑے رہیں۔
درختوں سے کچے پھل توڑنے، چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاروں کو ایڑیوں تلے مسلنے میں بہت لطف تھا۔ حادثوں کے خاموش مناظر، جو ذہن کی دیواروں سے چپکے تھے، اسے مسحور کرنے لگے تھے۔ اور اس روز جب کرکٹ کھیلتے ہوئے اچھو کے چوٹ لگی تھی۔ اور اس کے ہونٹ سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔ اور پھر اس کا ہونٹ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ اسے اس منظر سے عجیب طرح کا سکون ملا تھا۔ صفیہ باجی کی گالیاں اب زیادہ مزا دینے لگی تھی اور چپکے چپکے کانچ کے برتن چھن سے پکے فرش پر پھینکنے میں عجیب راحت تھی۔ سفید شلواروں پر گرجانے والی روشنائی اتنی بھلی دکھائی دیتی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ موت کی طرف بڑھ رہی ہے، مگر جب

یہ گھپ اندھیرا اُٹھتا تو لمحے بھر کی مہلت نہ دیتا، آن کی آن میں سب کچھ اس اندھے غار میں گر جاتا۔

اب گڈو صبح امّی کے پاس چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کا سبق پڑھتی۔ (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ نہیں لوٹیں گے) یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ اُسے اپنا آپ جہنم کے شعلوں میں جلتا نظر آتا۔ وہ کرب کے عالم میں دیوانوں کی طرح بھاگنے لگتی۔

"انتہا ہے بدتمیزی کی!" صفیہ باجی اب مجبور ہو کر محض اتنا ہی کہتی تھیں۔ وہ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی رہتی۔ تمہیں کیا معلوم۔ ہم اندھیرے کے گول چکنے گنبد سے پھسل رہے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ان کو سب کچھ بتا دے۔ کیا تم نہیں جانتیں ہمیں اّبا جی سے شدید نفرت ہے اور امّی کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں؟ کیا تم نہیں جانتیں ہم بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور بے حد غیر محفوظ؟ ہمارے گرد کوئی فصیل، کوئی حصار نہیں، یہاں تک کہ سمتیں بھی مر چکی ہیں؟ مگر وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھ کر رہ جاتی۔ صفیہ باجی دانت پیسنے لگتیں۔

امّی نے ایک بار اس کو پھولوں کی کیاری میں سائیکل چلاتے دیکھ کر کانپ کر کہا تھا: "خدایا۔ باپ کا جنون اس کو تباہ کر دے گا۔ رحم کر!"

"رحم کر!" اس کے دل میں کسی نے روتے ہوئے پکارا تھا۔ مگر آواز پھر تاریک انتشار میں ڈوب گئی۔

اچھو کے کمرے سے سگریٹ چرا کر پینے میں اُسے بڑا لطف آتا تھا۔ کھانسی کے مارے آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگتا مگر دم گھونٹتی تلخی سے اس کے اندر کچھ جھوم جھوم اُٹھتا۔ ایک روز اچھو نے اسے سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور اُسے پکڑ کر خوب پیٹا تھا۔ مگر وہ ہنستی رہی۔ "تم کیوں نہیں مانتے کہ تم کیا ہو؟ وہ چلا چلا کے کہتی رہی اور اس کے بعد فرش پر لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، یہاں تک کہ رات ہو گئی۔

ظفر بہت دن غائب رہا، پھر ایک شام اچانک آگیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ اپنی سائیکل ٹکا کر وہ اچھو کے کمرے کی طرف جارہا تھا کہ اچانک اس نے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا تھا۔ معلوم نہیں اسے دیکھ کر اس کے جسم میں برف سی کیوں جمنے لگی۔ ایک بے نام خوف سے وہ لرزنے لگی۔ بھاگ کر وہ امّی کے پاس باورچی خانے جا بیٹھی۔ مگر اب تو کہیں بھی پناہ نہ تھی۔ امّی کے بے جان سے چہرے کو دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ فصلیں مدت ہوئی گر چکیں۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ اندھیرے کے اس گنبد سے پھسلتے ہوئے اس کے ہاتھ پھسلتے رہے۔ مگر کہیں بھی تو اٹکاؤ نہ تھا۔ باورچی خانے کے دروازے کے ساتھ لگ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

امّی نے لپک کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ دہشت سے ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

"چپ ہو جا پاگل۔ چپ ہو جا۔ تم سب لوگ مجھے مار ڈالو گے۔ دیوانو، تم مجھے مار ڈالو گے۔" ان کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔

اگلے روز جب وہ کالج سے آرہی تھی ظفر اسے راستے میں مل گیا۔ "میں یونیورسٹی سے آرہا ہوں۔" وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور وہ اپنے ہاتھوں کی لرزش دوپٹے میں چھپانے لگی۔

"تمہارے لئے کچھ کتابیں نکلوائی ہیں لائبریری سے۔"

"اچھا۔۔۔ چلے جاؤ۔۔۔" اس نے بمشکل کہا اور فٹ پاتھ کی اینٹیں گنتی چلنے لگی۔ وہ ہولے ہولے مسکراتا ہوا دوسری سڑک پر ہولیا۔ اس کا جی چاہا کاش ظفر آج راہ چلتے بس سے ٹکرا جائے۔ وہ جانتا ہے۔ ہم سب غیر محفوظ ہیں۔ کاش وہ نہ ہوتا وہ سسکیاں روک کے چلتی رہی۔

دروازے پر اچھو نے اُسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔

"بولتی کیوں نہیں؟ بات کیوں نہیں کرتیں؟ مرنے کی ٹھان رکھی ہے؟" وہ غصّے سے چلایا۔

"چپ رہو!" وہ مٹھیاں بھینچ کر دھاڑی۔ اور اندر دالان میں امّی مشین پر جھکی کانپا کیں۔

"جنگلی، بدتہذیب، کمینی" صفیہ باجی نے اس پر موٹی سی کتاب دے ماری اور وہ ایک ساتھ رونے اور ہنسنے لگی۔
شام کو ظفر اس کے لئے کتابیں لے کر آیا وہ اچھو کے کمرے میں بیٹھی تھی۔
"مجھے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا تھا۔
"اچھا!" ظفر نے اپنی جڑھی ہوئی بھوں چڑھا کر ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا اور کتابیں میز پر رکھ دیں۔ اچھو ٹائپ رائٹر پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ظفر نے سگریٹ سلگائی۔
"تم بہت مضبوط ہو تسنیم۔" اس نے آہستہ سے کہا، "کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ ہر چیز بھربھری ریت سے بنی ہے؟"
"نہیں۔" اس کا جی چاہا وہ صفیہ باجی ہوتی اور کوئی موٹی سی گالی دیتی پھر اس نے ایک ہی سانس میں کہا تھا، "میں تمہاری منحوس آواز کو مٹا ڈالوں گی۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ آج رات میں ابا جی کے لئے دروازہ نہیں کھولوں گی۔ صبح وہ سیڑھیوں میں ڈھیر ہوں گے تو بڑا لطف آئے گا۔ مجھے تو تم سے شاید نفرت ہے۔ مجھے لگتا ہے میں تمہارا گلا گھونٹ ڈالوں گی۔"
موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر تیزی سے بہنے لگے۔ ظفر کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔
"دنیا ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہے۔ تسنیم۔ ہم نے اسے اس زور سے بھینچا ہے کہ وہ ریت بن کر اڑ گئی ہے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔"
وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے باہر چلی گئی۔
اس رات جب ابا جی نے دروازے پر دستک دی تو وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ "بازی گوئی کہ دامن تر مکن، ھشیار باش۔" وہ باہر کھڑے الاپتے رہے۔ اس کا دل ہر آواز پر ڈوبتا رہا۔ تکیے میں منہ چھپائے وہ سسکیاں

بھرتی رہی۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ میں ختم ہو چکی ہوں۔ گرم گرم آنسو اس کی گردن تک بہتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد امی ننگے پاؤں بھاگتی آگئیں۔ کنڈی کھولتے ہوئے انہوں نے آنسو بھری آواز میں کہا تھا: "یا خدا ان پر رحم کر!"

"رحم کر! اس کے اندر بھی کسی نے بے بسی سے پکارا تھا۔

امی اور ابا جی اپنے کمرے میں چلے گئے اور کچھ دیر میں ابا جی کی سسکیوں کی آواز رات کی خاموشی کو چیرتی اس کے کان سے ٹکرائی: "بچھی۔ بچھی —" وہ بچوں کی طرح امی کو پکار رہے تھے۔ اس کا جی چاہا مکان کی چھت گر جائے اور مکمل اندھیرا ہر چیز کو نگل لے۔ پھر ایک دم، معلوم نہیں کیسے، ظفر کے نسوں بھرے ہاتھ اس کی آنکھوں سے آن ٹکرائے۔ سانولی جلد پر چمکتے ہوئے سنہری بال۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں مگر ہاتھ زیادہ نزدیک آگئے۔ سیاہ فیتے والی بھاری سی سفید گھڑی اور چھوٹے چھوٹے چپٹے گلابی ناخن۔

"کمینہ" اس نے دانت پیس کر کہا اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔

اتوار کے روز اچھو اور ظفر دن بھر لان میں بیٹھے جانے کس چیز کا مسودہ تیار کرتے رہے۔ اچھو نے تین بار چائے مانگی۔ بخو بیگم سینی میں چائے گراتی دھپ دھپ لان میں آتی جاتی رہی۔ اس کے گلے میں تلخ ابکائیاں آن آن کر اٹکتی رہیں۔

جب شام کے سائے ہولے ہولے دیواروں پر اترنے لگے اور سڑکوں کا شور خاموشی کو گہرا کرنے لگا۔ صحن میں امی نماز پڑھنے لگیں۔ وہ برآمدے میں کھڑی زمین میں جذب ہونے والے درختوں کے سائے دیکھتی رہی۔ چیونٹیوں کی لمبی قطاریں سوکھی گھاس میں اپنا رستہ ڈھونڈتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں کچھ سر سرانے لگا۔ (میں ان چیونٹیوں کو مسلوں گی یا نہیں؟ اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا۔) سویٹ پیز کی باس اڑ رہی تھی۔ اس وقت

یک دم اُسے خدا کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے ستون کے ساتھ چہرہ ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"وقت دیکھ رہی ہو؟" ظفر اس کے قریب سائیکل لا کے کھڑا تھا۔

"نہیں۔ کچھ نہیں دیکھ رہی" اس نے آنسو روک کر کہا اور ستون کے نقوش پر ناخن پھیرنے لگی۔ ظفر اس کے قریب سیڑھی پر آگیا۔

"تو تم جانتی ہو ۔ یہاں کچھ بھی محفوظ نہیں ۔ ہم اندھے اور بہرے ہیں"۔ اس نے اپنی گھلتی آواز میں کہا۔

"چپ ہو جاؤ!" اس نے لرز کے کہا۔

"اور اگر ہمیں اس اندھیرے کے گنبد سے پھسلتے ہوئے کسی چیز کا سہارا نہ ملا تو ہم ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر جائیں گے۔"

"نہیں" اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

"ہاں" ظفر نے ہولے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ دکھ کی وہی ٹیس کہیں گہرائیوں میں اٹھی جو کبھی امی کے ستھرے پاؤں پر جھکتے ہوئے اٹھتی تھی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مُنّی"

شروع شروع میں محض بے نام سے ہیولے اس کے ذہن میں اُبھرتے۔ پل بھر پرچھائیوں کی طرح ڈولتے اور پھر دب جاتے۔ اور اس پل کے بعد وہ جب بھی ان کی تفصیل کریدنا چاہتی، سوائے ملگجے غبار اور جانے پہچانے، مگر بھولے بسرے احساس کے کچھ بھی تو اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ پھر وہ ملگجا غبار جو ایک محدود دائرے میں بادلوں کی طرح تیرتا ہوتا، ہولے ہولے پھیلنے لگتا، اور اس کے چاروں طرف اُڑتی گرد کی ایک چادر سی تن جاتی۔ وہ سارے کمروں میں بادلوں کی طرح چکر لگاتی پھرتی، جیسے کوئی بہت ہی ضروری چیز کہیں رکھ کے بھول گئی ہو۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" اِمتی جاسوسی ناول پر سے نظر اُٹھا کر پوچھتا۔

"ہیں ــ؟ کچھ بھی نہیں ــ" وہ فوراً وہاں سے بھاگ جاتی۔

باورچی خانے کے سامنے سرخ اینٹوں کے برآمدے میں اماں حاجن مائی سے اس کے دکھڑے سُن رہی ہوتیں۔ اور سامنے رنگ اُڑی دری پر بچھی گندم کو دانہ دانہ کرکے بینتی جاتیں۔ حاجن مائی کا باریک کرتے میں تھل تھل کرتا پیٹ دیکھ کر اس کی گردن میں گدگدی اُٹھنے لگتی۔

"ہنسے جاتی ہے چھوٹی بی بی ــ" حاجن مائی اس کی ہنسی کو ہمیشہ ہی سے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھتی آئی تھی۔ جیسے اس نے اماں سے کہہ ہی تو دیا ہو کہ کل یہ مزنگ کی طرف سے اتنا بڑا گٹھر سر پہ اُٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اور یہ کہ ۲۴ نمبر والی

عذرا نے اسے بتایا ہے کہ اس کا میاں اچھا خاصا آج کل اس کی کوٹھریا میں براجمان ہے، اور یہ جو حاجن مائی دوبارہ حج کرنے کے لئے گھر گھر سے پیسے جمع کرتی پھرتی ہے تو دراصل ہنی مون پہ جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے بیسیوں ہی مرتبہ اماں کو یہ خبر سنانا شروع کی مگر ہر بار ہی ان کے تاثر سے عاری چہرے نے اس کی ہمت توڑ دی۔

بڑے بھیا اور رضیہ باجی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ انہیں آج تک کسی بات سے محظوظ نہ کر پائی تھی (اور پھر بڑے بھیا کی اُن ہی دنوں گلبرگ کے ایک کنسٹریکٹر کہ دراصل ٹھیکیدار ہوتا ہے، کے یہاں منگنی طے ہوئی تھی۔ اور رضیہ باجی ہمیشہ کی طرح ابا میاں کو گلبرگ میں کوٹھی لینے پر مجبور کر رہی تھیں ــ اور بات ہمیشہ ایک صحتمند اور پُر وقار ماحول سے شروع کرتی تھیں ــ کہ فی الحال یہ جو کوٹھی تھی، نام کو تو سول لائنز میں تھی مگر ماحول تو وہی تھا محلوں والا) امی نے بھی اس خبر میں خاص دلچسپی نہ لی۔ چنانچہ اتنا بڑا اسکینڈل صابن کے بلبلے کی طرح اپنے خوبصورت رنگ سمیٹے آپ ہی ختم ہو گیا۔

حاجن مائی میں اس کو جو شدید دلچسپی تھی، اس کا تجزیہ کرنے کی بھی اس نے بیسیوں مرتبہ ہی کوشش کی تھی، مگر ہر بار آدھے رستے پہنچ پہنچ کر اُلجھ گئی۔ یوں ہی اس کو وہم سا تھا کہ اس ملگجے غبار اور ہیولوں کا حاجن مائی کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔ ورنہ کیوں یوں ہوتا کہ جب وہ چادرِ خاک اس کے گرد تنتی، اور وہ سارے گھر میں باؤلوں کی طرح وہ چیز ڈھونڈتی پھرتی جو دراصل تھی ہی نہیں لہٰذا اس کے گم ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور ایسے میں اگر وہ اتفاق سے حاجن مائی سے ٹکرا جاتی تو باریک گرد کے اُڑتے ذروں میں ٹھہراؤ سا آجاتا اور اسے یوں لگتا جیسے اس نے مٹیالے رنگ کی کوئی بامعنی سی تصویر دیکھ لی ہو۔ اور اس کے باوجود کہ حاجن مائی کی چپچپاتی آنکھیں دیکھ کر اس کی کمر میں بے شمار چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر بیوگی کا المیہ سُننے لگتی ــ وہ المیہ جس کو سناتے ہوئے حاجن مائی بڑی کوششوں سے کہیں حلق میں سے آواز نکال کر اور دوپٹے سے آنکھیں مل مل کے رقت پیدا کرتی۔

"بس بی بی — کسی پر بُرا وقت نہ پڑے — تقدیر کا لکھا کہاں مٹتا ہے؟" وہ اماں کی تقدیر پرستی کی رگ کو چھیڑ دیتی — اور بس اماں کا دل موم ہو جاتا۔ رومال سے پیسے کھولتے ہوئے اماں کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

"ہاں سچ کہتی ہو — زمین آسمان کا حال لوحِ محفوظ میں درج ہے — اس کے حکم کے بِنا تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔"

فضا میں مابعد الطبیعاتی رنگ پیدا ہونے لگتا۔ اس کے ذہن میں اترتی گرد کے پیچھے لوحِ محفوظ کے عجیب عجیب ہیولے اُبھرنے لگتے — اور بے شمار نبضیں اس کے جسم میں دھڑکنے لگتیں وقت کا احساس اس کا دل جکڑ لیتا — میں پل پل بڑی ہو رہی ہوں — ہر حرکت، ہر قدم، وقت ہے۔ بازو ہلانا، چلنا ہنسنا، سب زندگی کے لمحے ہیں — اس کا ذہن گول گول دائروں پر گیند بنا گھومنے لگتا۔ اسے سفید کاغذ پر گہری سیاہ لکیروں سے قریب قریب بنے وہ دائرے یاد آ جاتے جو کاغذ کے ذرا سے گھمانے پر خود بھی تیزی سے گھومنے لگتے۔ یہ دائرے سب سے پہلے ایک لڑکی سعیدہ نے اس کو دکھائے تھے، جس کی صورت اس کو یاد نہیں تھی، مگر اس کے وجود کا احساس اس کے اندر زندہ تھا۔ سعیدہ جو اندھیری سیلی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بڑے ہونے کے عجیب و غریب ثبوت اس کے سامنے گنا کرتی — ایک گھنی سیاہ متلی سے وہ چکرا گئی۔ بہت اندر بے پناہ اُداسی پھیلنے لگی۔ اسے پھر یوں لگا جیسے اُسے کہیں جانا ہے اور وہ اس سفر کے لیئے بالکل تیار بیٹھی ہے۔

"حاجن مائی — ذرا چولہے تو بنا دینا — سب کے سب ٹوٹ گئے۔" اماں نے حاجن مائی کی دُکھتی رگ چھیڑ دی تھی۔ حاجن مائی اس معصوم جملے سے سناٹے میں آ گئی — پھر ایک دم دوپٹے سے آنکھیں ملنے لگی۔

"ارے بی بی — مجھ دکھوں کی ماری میں کہاں اتنی ہمت — یہ دیکھو — میرے ہاتھ، دو مہینے سے بس انگلیوں کا درد نہیں جاتا۔" اس نے اپنے چوڑے چکلے ہاتھ سامنے پھیلا دیئے۔

اماں کے ساتھ اُسے بھی ہنسی آ گئی ۔ حاجن مائی کو کبھی چاول تک چھننے کے لئے کہہ دیتے تو وہ فوراً اپنے دکھیا ہوئے اور دو مہینے سے آنکھوں کے درد کا قصہ سنانے لگتی ۔ اور ہر قسم کی بیماریوں کی فہرست پیش کرنے کے بعد حاجن مائی کی گنگ آنکھوں میں واقعی بڑا مخلص درد سلگنے لگتا۔ اور اس کی نگاہیں کہیں دور دراز کے نقطے پر جم کر بکھرنے لگتیں۔ مارے خوف کے اس کے جسم کا روآں روآں کانپ جاتا۔ حاجن مائی کی ایسی ہی نگاہوں سے اس کے ذہن کا کوئی نامعلوم سا رشتہ تھا۔ کوئی انجانی قوت اُسے خلا میں بکھرتی اس نگاہ سے قریب تر کھینچے لئے جاتی ہے ۔ جیسے مقناطیس اس کے بالوں کی پنوں کو اپنے سینے سے چمٹا لیتا تھا۔

"اپنے گھر میں تو لوہے کے چولہے تھے بی بی ۔ اتنے اتنے بڑے دیگچے پک جاتے تھے ۔ صبح شام بیسیوں آدمی کی روٹی پکتی تھی ۔ تحصیلدار کھاتا ہے تو پھر کھلاتا بھی تو ہے نا۔ ڈاک بنگلے میں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی افسر آن ٹھہرتا ہے ۔"

اس کا روآں روآں، پیاسی زمین پر گرتی بوندوں کی طرح، حاجن مائی کے الفاظ جذب کرنے لگتا۔ پھر حاجن مائی امرود اور سنترے کے باغوں کا ذکر کرتی اور چنوں کے کھیت جو اس کے گھر کے پچھواڑے تھے ۔ اور بھوری بھینس جو ایک وقت میں دس سیر دودھ دیتی تھی۔

"بی بی ۔ دودھ دوہتے دوہتے میرے بازو اکڑ جاتے تھے"۔ وہ اپنے بازو کو ہاتھوں سے دباتی جیسے اب بھی دکھن کہیں اس کے پٹھوں میں سرسراتی ہو۔ اور پھر پیتل کے چمکتے برتنوں اور کروشیے کے بڑے بڑے رومالوں اور رنگیں پھولوں والی چنگیروں کا ذکر کرتے کرتے وہ خاموش ہو جاتی ۔ "دراصل بی بی ۔ گھر کی مٹی کے ساتھ رشتہ ہوتا ہے آدمی کا، لاکھ توڑو ۔ مگر کہاں ٹوٹتا ہے ۔ روح تو وہیں بستی ہے نا ۔"

وہ ۔ جو مانس رو کے ذہن کے پردوں پر بھوری بھینس اور رنگین پھولوں والی چنگیروں اور پیتل کے چمکتے برتنوں کو سرکتے دیکھتی ہوتی ۔ ایک دم سناٹے میں آ جاتی ۔ حاجن مائی چینی کی پوٹلی اور کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھری اٹھائے، چپل گھسیٹتی،

لکڑی کے پرلے گیٹ سے باہر نکل جاتی، لوہے کا بھاری کنڈا، دروازے پر آن گرتا ___ اور اس کے ہاتھ کچھ پکڑتے پکڑتے رہ جاتے ___ ذہن کے دھندلے کناروں سے باریک گرد کے پیچھے بے نام چیزیں ہولے ہولے پھسل کے گرتی رہتیں۔ انجانی باتیں یاد آ آکے رہ جاتیں اور دانتوں تلے کچھ کرکرانے لگتا ___

پھر یوں ہوا کہ ایک شام وہ آرام کرسی میں بیٹھی تھی۔ اور باہر گراؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے (پھولوں میں ہم آتے ہیں ٹھنڈے موسم میں) اور امتی برابر والے کمرے میں بیٹھا انگریزی ریکارڈ سُن رہا تھا۔ اور تمام کا تمام گھر کسی ڈرامے کا سین نظر آرہا تھا۔ (سوائے اس کے کہ باورچی خانے سے پیاز کے بگھار کی مہک آ رہی تھی اور مغرب کی اذان کے آخری لفظ بھی فضا میں تیر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس منظر سے باہر تھا) اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو سلیٹی چھجے والے مکان کے جنگلے پر جھکے دیکھا ___ (کانوں تک کٹے بالوں اور پتلی ٹانگوں پر چڑھے سفید چست پاجامے والی چھوٹی سی سانولی لڑکی)، اور نیچے تنگ گلی میں گیس اُٹھائے لوگوں کا ہجوم جا رہا تھا۔ اور بڑی بڑی رنگین پگڑیوں والے انسانوں کے گلے میں گیندے اور تلّے کے لمبے لمبے ہار جھول رہے تھے۔ اور بے شمار بچے ان کے پیچھے کودتے چلے جا رہے تھے۔ عید کا چاند ہو گیا تھا اور ٹولیاں گلیوں میں گاتی پھر رہی تھیں ___ اور سب سے آخر میں لالٹین اُٹھائے، بھوری لوئی کی بُکل میں چہرہ چھپائے ایک آدمی چلا جا رہا تھا ___ "میرے پاؤں میں پڑ گئے چھالے کالی کملی کے اوڑن والے۔" اور تمام شور اور انتشار اس ایک اکیلی ہوک نے نگل لیا تھا ___ تمام گلی میں سناٹا چھا گیا ___ گلی کے آخری سُرخ مکان سے لے کر تنّدور کے چھپر تک سب میں سناٹا تھا۔ گھوں ___ گھوں ___ گھوں ___ گھوں ___ وہ گیند بنی سفید کاغذ کے سیاہ دائروں پر گھومتی چلی جا رہی تھی ___ اور بیچ کے چھوٹے سے دائرے میں ایک مُنّا سا کتّا دم اُٹھائے کھڑا تھا ___ اور باریک گرد کا کالا دھواں ہولے ہولے سانس لے رہا تھا ___

"اِمتی ___ اِمتی ___" اس نے زور سے پکارا۔ اس کا دل دیوانوں کی طرح پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا ___ اور ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔

"کیا ہے؟" امتی نے دروازے میں سے جھانک کے پوچھا۔ وہ اس کی نگاہوں کی لاتعلقی سے ڈر گئی۔

"کچھ نہیں۔" ۔ امتی ۔ تمہیں وہ سلیٹی چھجے والا گھر یاد ہے؟"

"مسلم گنج والا؟" اس نے اسی لاتعلقی سے پوچھا

"ہاں ۔ جہاں وہ سیلی سیڑھیاں تھیں۔ اور سیڑھیوں کے بالکل ساتھ بالکل چھوٹا سا غسل خانہ جہاں دن میں بھی بتی جلتی تھی ۔ اور جہاں ہم کبھی نہیں جاتے تھے۔ اور وہ اندر صحن میں لوہے کا جنگلہ تھا اور نیچے بھی بڑا گہرا صحن تھا۔ کنوئیں جیسا۔"

"تو پھر ۔؟" وہ ہنسنے لگا۔

اور سامنے کے مکان میں کوئی مر گیا تھا تو لکڑی کے جنگلے والا پلنگ آیا تھا اور ایک چھپکلی اس کی نواڑ میں سے نکل کر زمین پہ بھاگ گئی تھی۔"

امتی نے اپنی نئی نئی مونچھوں کو انگلی سے ہموار کیا اور جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

تب یوں ہونے لگا کہ وہ بیٹھے بٹھائے، سلیٹی چھجے والے مکان میں خود کو گھومتا دیکھنے لگی۔ سیلی قلعی کی بُو اس کے حلق میں اٹک جاتی۔ لاٹو گٹے والا، لکڑی کے چمکتے ہوئے موٹے سے ڈنڈے پر سفید، گلابی اور ہرا گٹا لگائے گھنٹی بجاتا پھرتا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی سڑک پر پہنچتی۔ اور باریک تیلیوں اور گٹے کا حقہ بنواتی، یا پھر لمپ ۔ لمپ میں آسانی یہ تھی کہ تمام گٹا بس ایک ہی جگہ رہتا۔ گلابی گٹے کا بلب اور سفید موٹا گٹا تمام کی تمام تیلی ڈھانپ لیتا۔ مزے سے تیلیاں چاٹتی وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھتی اور الائچیوں کی ٹھنڈک اس کے حلق میں نیچے تک اترتی جاتی۔ اوپر آبا میاں حقہ کی نے منہ میں لئے بڑے بھیا کو حساب کا کوئی سوال سمجھاتے ہوتے، جو وہ بار بار سمجھانے پر بھی غلط ہی کئے جاتے۔ اور آبا میاں ان کی کند ذہنی سے عاجز آ کر میز پر مکے مارتے اور اماں کو ڈانٹتے اور تمام گھر کی دیواریں لرزتی ہوتیں۔ اس کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبنے لگتا۔ پھر شاہ دولہ کے چوہے لمبے لمبے کرتے پہنے، اپنے مالک کے کندھے پر ہاتھ رکھے، چھوٹے سے ہلتے ہوئے سر میں گھومتی بڑی بڑی آنکھیں گھوتے۔ گلیوں میں گھومنے لگتے ۔ دروازوں پر دستک دیتے، سیڑھیاں چڑھ آتے، بجلی کے

دھچکے الیسی سنسنی اس کے تمام جسم میں تیر جاتی اور وہ شیشے والی الماری کے پیچھے چھپ جاتی۔ دیوار کے ساتھ جالے کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں لگی ہوتیں جو اس کے بالوں میں لگ جاتیں۔ اور باریک گرد اس کے نتھنوں میں پردے کی طرح جمنے لگتی۔ اس کی سانس رک جاتی۔ اور وہ جاگ اُٹھتی۔ حالانکہ وہ پہلے بھی جاگ رہی ہوتی۔

"کیوں اماں — میں کوئی بھلا سو رہی تھی؟" وہ اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھتی۔ اماں اس کے سوال کو انتہائی غیر ضروری جان کر خاموش رہتیں۔ رفتہ رفتہ اس کا شک یقین میں تبدیل ہونے لگا۔ اس جگہ کے علاوہ وہ کہیں اور بھی موجود تھی۔ اپنے وجود کے پھیلنے کے اس احساس سے مارے خوف کے وہ کانپ جاتی۔ اس کے اندر ایک بھیانک خلا پھیلتا جا رہا تھا ہر لمحے اس کو یوں لگتا جیسے وہ کوئی بڑا ضروری کام بھول گئی ہو۔ وہ کسی آن جانے سفر کے لیے ہر دم تیار رہتی۔ ارد گرد پھیلے تمام لوگ اس کو مکالمے بولتے محسوس ہوتے۔ جیسے وہ ہر بات، ہر حرکت، برسوں کی ریہرسل کے بعد کر رہے ہوں اور یہ ریہرسل وہ پہلے ہی دیکھ چکی ہو۔

چنانچہ وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی سڑک پر گزرتی موٹروں، ٹانگوں اور بسوں کو دیکھتی رہتی۔ اور اپنے آپ کو یقین دلاتی رہتی — "میں یہیں ہوں — محض یہیں۔" مگر اس کے اندر کوئی چیز ہولے ہولے کسی سمت کو کھینچنے لگتی۔ اور اسے حاجن مائی کی ایک نقطہ پر جم کر بکھرنے والی نگاہیں یاد آ جاتیں۔

اسکول میں وہ تمام دن چھٹی ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔ گھر۔ گھر۔ گھر۔ اس کی کنپٹیوں میں ایک ہی لفظ دھڑکن بن کر گونجتا رہتا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کو شدید احساس ہوتا "یہ تو وہ جگہ نہیں —" جہاں اسے پہنچنا تھا۔

"اماں بھلا مسلم گنج والے مکان کو چھوڑے کتنے برس ہو گئے ہوں گے؟" اس نے ایک روز پوچھا۔ جب کہ رضیہ باجی صوفے پر بیٹھی پاؤں پر کیوٹکس لگا رہی تھیں اور رامی آرام کرسی پہ لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا اور ٹانگ ہلائے جاتا تھا۔

"اُفوہ — تم پہ کیا مسلم گنج کا بھوت سوار ہے — بور کر دیا۔" وہ چلایا۔

"تجھے کیا یاد ہوگا بھلا — چار پانچ برس کی تو تھی تو — دس برس گزر گئے —" اماں نے اون کا گولہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

"پروین تو نے بڑا اچھا وقت دیکھا ہے —" رضیہ باجی نے لمبوترے ڈھکنے والی شیشی بند کرتے ہوئے کہا۔

"اور بھلا اماں وہ مکان دیکھا ہے اب کبھی — وہیں ہے نا — اسی طرح سلیٹی چھجا تھا نا — اور — اور —" تاریک غبار کے مرغولے اٹھ اٹھ کر بڑھنے لگے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی — اس کے جسم میں تمام اعضاء بُری طرح حساس ہو گئے۔ الگ الگ ہاتھ، پاؤں، بازو، ٹانگیں، سب میں الگ الگ اپنے وجود کا احساس جاگ اٹھا۔ جسم اپنی وحدت کھو کر مختلف اعضاء کا مجموعہ رہ گیا تھا۔ اور اسے بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ سانس لے رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اتنا مانوس اتنا جانا پہچانا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں کا نمکین مزا سُلگ اٹھا۔ تب اس نے دیکھا کھلی چھت پر ایک طرف برساتی میں بہت سی چارپائیاں کھڑی ہیں اور کہیں سے پتھر کے کوئلے کی بڑی تیز بو آرہی ہے۔ اور برساتی کے اندر ایک دیوار میں چھوٹی سی بند کھڑکی کی سِل پر سر جھکائے ایک سانولی، دُبلی سی لڑکی کھڑی ہے جس کے بال کانوں تک کٹے ہیں۔ اور اس کی سوکھی ٹانگوں پر سفید چسپت پاجامہ ہے۔ سانولے چہرے پر بڑی بڑی کالی آنکھیں سُلگ رہی ہیں۔ ٹپ ٹپ آنسو بہہ کر کھڑکی کی سِل میں جذب ہو رہے ہیں اور مٹی کی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی ہے اور قریب ہی زمین پر لکڑی کا وہ ڈبہ پڑا ہے جس میں ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور بوتلوں کے ڈھکنے اور رنگین کپڑوں کی کترنیں ہیں۔ اپنے آپ کو پہچان کر اس کا تمام جسم لرز اٹھا۔ "یہ لڑکی بھی میرے اندر رہے ہے — اور شاید مجھ سے باہر بھی —" چنانچہ اس کے بے شمار وجود اندھیری رات میں اس کے گرد گھومنے لگے۔ بھورے رنگ کی بند کھڑکی کہیں اندھیروں سے نکل کر اس کی آنکھوں میں ثبت ہو جاتی اور پھر لوٹ جاتی ہے۔

اسے یقین ہو گیا۔ "مجھے وہاں جانا ہے، اس لئے کہ وہاں میں، بند کھڑکی میں

کھڑی رو رہی ہوں۔ دگھر کی مٹی کے ساتھ رشتہ ہوتا ہے آدمی۔ لاکھ توڑ دو۔ مگر کہاں ٹوٹتا ہے —— روح تو وہیں بستی ہے نا—— تمام دنیا خلا میں بکھرتی نگاہ تھی ——)

بند کھڑکی میں سر جھکائے کھڑی اس لڑکی کے سائے نے تمام ہیولوں کو نگل گیا۔ بھوری لکڑی کا کھردرا لمس اور سوندھی مٹی کی مہک اس کے روئیں روئیں میں جلنے لگی—— مجھے وہاں جانا ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے —— وہ دھیرے دھیرے دل کو دلاسا دیتی رہی۔

مگر سب سے بڑا مسئلہ تو وہاں پہنچنے کا تھا۔ اِمّی سے کسی قسم کی توقع ہی فضول تھی۔ وہ تو اُلٹا گھر بھر میں ایک اشتہار پھیلا دیتا۔ امّاں اور ابا میاں کو ذرا سا شک بھی ہو جاتا تو قیامت آجاتی۔ اور سب سے بڑھ کر رضیہ باجی جو گزرے وقت کے ہر لمحے سے نفرت کرتی تھیں —— اور اکیلے تو اس گلی میں قدم رکھتے ہی وہ مر جائے۔ وہیں کھڑے کھڑے کچی مٹی کی طرح اس کے ذرّے بکھر کر ہوا میں اُڑ جائیں۔

وہ گرمیوں کی چھٹیوں کا ایک دن تھا۔ حاجن مائی کہیں سے ایک سر درد اُٹھائے آئی تھی اور امّاں اندر سے اس کا ایک روپیہ لینے گئی تھیں۔

"حاجن امّاں —— کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ مثلاً —— جو اپنا گھر ہوتا ہے نا—— اچھا تم بتاؤ —— کبھی ہوشیار پور گئی ہو اپنے گھر؟"

حاجن مائی نے بڑی ٹھنڈی آہ بھری۔

"لو بیٹیا—— گئی کہاں ہوں —— اتنا پیسہ کہاں ہے میرے پاس، مگر خواب میں تو روز ہی اپنے آپ کو وہاں چلتے پھرتے دیکھتی ہوں —— کچھ یہاں سے —— میرے اندر سے کھینچتا ہے۔"

اس نے اپنے تھل تھل کرتے پیٹ سے ذرا اوپر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"امّاں —— بھلا مزنگ جاتی ہو؟"

"ارے نہیں تو——" حاجن مائی فوراً چوکنی ہو گئی —— اس کے چہرے پر وہی مخصوص حفاظتی سختی اُبھر آئی جو اس کو ہنستا دیکھ کر ہمیشہ اس کے چہرے پر آجاتی تھی۔

"میں نے تو خود دیکھا ہے —— اتنا بڑا گٹھر اُٹھائے —— اور چوبیس نمبر والی عذرا بتا رہی تھی

تھی کہ —"

"ہاں ہاں جاتی ہوں — مگر مانگنے تھوڑی جاتی ہوں — میرے اپنے لوگ رہتے ہیں وہاں — بی بی سے نہ کہنا — "

"مجھے بھی لے چلو — مسلم گنج ہے نا، وہاں جو سلیٹی چھجے والا مکان ہے وہ میرا گھر ہے —" اس نے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا۔

"کوئی سہیلی رہتی ہے کیا؟ حاجن مائی نے فوراً اس کی بات کی تصحیح کی اور دانتوں میں خلال کرنے لگی۔

"ہاں ہاں — سہیلی بہت پرانی —"

اماں کو حاجن مائی پر اتنا بھروسہ تھا کہ خود اپنے آپ پہ اتنا نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ سہیلی کے گھر جانے کی اجازت لینا تو محض رسمی سی بات تھی —

تمام رستہ، پاگلوں کی طرح دھڑکتے دل کی دھم دھم کو دبا کر، بڑی اونچی آواز میں اسے حاجن مائی کو یقین دلانا پڑا کہ وہاں وہ سہیلی سے ملنے قطعاً نہیں جا رہی — محض اس مکان سے ملنے جا رہی ہے اور شاید اپنے آپ سے بھی — یہاں پہنچ کر وہ پتھر بن گئی — اور جب اس نے وہاں قدم رکھا تو دھوپ میں سانس لیتی اس گنجان گلی نے اس کو نگل لیا۔ کچے احاطے میں تندور کے گرد بچوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پراتوں میں گورے آٹے کے بڑے بڑے پیڑے ہولے ہولے پھیل کر ایک دوسرے میں مل رہے تھے۔ بھٹیارن کہنی تک گیلا کپڑا لپیٹے تندور میں سے بھوری بھوری روٹیاں نکال رہی تھی — اور بچے تندور میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے — فضا میں روٹیوں کی بو پھیلی تھی۔ دو لڑکیاں کولھوں پر بچے اٹھائے گیڑی کا ڈا کھیل رہی تھیں — اور چھن شاہ کی مسجد کا کالے اور سفید کھردرے پتھروں والا فرش چمک رہا تھا — تالاب کے کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے نلوں سے پانی گر رہا تھا۔ بہت سے ستونوں والی چھت کے نیچے لمبی لمبی صفیں بچھی تھیں۔

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی — سلیٹی چھجہ اس کے قریب آ رہا تھا — اور قریب — یہاں تک کہ اس کی نگاہیں اس سے ٹکرا کر بکھر گئیں — اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا گلی سے باہر

ایک اجنبی شہر پھیلا تھا۔ اور اجنبی انسان تیزی سے اپنی اپنی راہوں پر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اور اس مکان کی دہلیز پر اس کے قدموں کی مٹی بالکل تازہ، سانس لیتی چمک رہی تھی۔ (معراج کی رات جب سرورِ کائنات صلعم سات آسمانوں کا سفر طے کرکے لوٹے تو ابھی ان کے دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی۔ اور بستر گرم تھا۔ چنن شاہ کی مسجد میں مولوی صاحب کہہ رہے تھے ــــ اور وہ جوتیوں کی قطار کے قریب دروازے سے لگی کھڑی تھی ــــ گلی میں لڑکے المونیم کے کٹورزوں میں تیل میں بھیگے پیسے بجاتے پھرتے تھے ــــ "معراج شریف کا تیل!")

اندھیری اور سیلی ڈیوڑھی کی سیڑھیاں (جہاں سعیدہ کے وجود کا احساس زندہ تھا) اوپر روشن، دالان کی دہلیز پر ختم ہوگئیں ــــ اونچے اونچے بازوؤں والی کرسی میں کوئی سفید دھوتی پہنے، منہ میں حقّہ کی نَے لئے بیٹھا، اخبار پڑھ رہا تھا۔ سنہری فریم والی عینک ناک پر بہت نیچے تک جھک آئی تھی۔ حقّے کی بو تمام کمرے میں پھیلی تھی ــــ اس نے حیران ہوکر حاجن مائی کی طرف دیکھا ــــ

"کیا بات ہے؟"

"اپنی بی بی ہے جی ــــ ذرا مکان دیکھنے آئی ہے ــــ یہاں رہتے تھے یہ لوگ ــــ"

حاجن مائی بے کار مسکرائے جا رہی تھی ــــ

بیچ کے کمرے میں سے (جس کی دیواروں کا رنگ زرد تھا اور جہاں تلے اوپر رکھے دیگچوں کا مینار سا بن جاتا تھا۔ اور ان دیگچوں میں سے کسی ایک میں ریوڑیاں ہوتی تھیں۔ امّی نیلی جھل جھل کرتی ساٹن کا نیکر کرتہ پہنے دیگچوں کے قریب کھڑا تھا اور وہ دروازے کی چق کے ساتھ لگی باہر جھانک رہی تھی ــــ) سفید بالوں اور گورے چہرے والی ایک عورت سر پہ زرد جالی کا دوپٹہ اوڑھے آ گئی ــــ

"کیا ہے مائی ــــ؟ مکان کیوں دیکھو گی ــــ کرایے کا ہے ــــ' عورت نے اس کو سر سے پیر تک گھورا ــــ اور اس کے دوپٹے سے ڈھکے سر پہ اس کی نظر رُک گئی ــــ

"اچھا ــــ!" اس نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا ــــ "ہندوستان سے آئی ہو کیا بی بی؟"

"نہیں — نہیں جی ہم تو یہیں رہتے ہیں —"

"اچھا۔ آجاؤ —" عورت کے گورے چہرے کی جلد کے نیچے چھوٹی چھوٹی نیلی رگیں چمک رہی تھیں — اور سامنے کا ایک دانت سونے کا تھا —

وہ مائی حاجن کا ہاتھ پکڑے سلیٹی چھجے کی طرف مڑ گئی — اس نے نیچے جھانک کر دیکھا — میر صاحب کی دکان پر بچوں کی بھیڑ لگی تھی — ریڑھی پر ایک آدمی تین اپاہج بچے ڈالے جا رہا تھا — مری ہوتی سوکھی باہیں، پاؤں کی جگہ گوشت کے دو لوتھڑے — بہت بڑے سر میں گھومتی ایک آنکھ — دیپمر کاغذ کے ہوائی جہاز شاں شاں کرتے چاروں سمت سے اڑ اڑ کر گلی کی کچی زمین پر گرنے لگے — اور سامنے کے مکان میں جھکی کمر والی بڑھیا کا جوان بیٹا بیمار تھا — شبیر کے کوٹھے کی منڈیروں کی چھوٹی چھوٹی برجیاں انسانوں کے سر نظر آ رہے تھے — ٹیو کے برآمدے میں طوطا بول رہا تھا — دو دن کا میلہ — دھم دھم دھم — ہاون دستے کی آواز آ رہی تھی — امی اور چھوٹی خالہ انار دانے اور چینی کا چورن بنا رہے تھے — نیچے اندھیرے کمرے کی درزوں سے آنے والی روشنی میں گلی میں آتے جاتے لوگوں کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں — کہیں بہت اندر، سناٹا پھیل رہا تھا — علاوہ اس جگہ کے وہ اندھیری سیڑھیوں میں موجود تھی — جہاں سعیدہ اس کو اپنے بڑے ہونے کے عجیب و غریب ثبوت گنوا رہی تھی — اور گھنی سیاہ مٹی کا سمندر چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا — ابا میاں نے ابھی ابھی چینی کی پلیٹ چھن سے زمین پر پھینکی تھی — "روز روز اتنا نمک — اس کم بخت گھر میں کوئی سنتا ہی نہیں —" بڑے بھیا تیسری مرتبہ دسویں میں فیل ہوئے تھے اور غسل خانے میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے — اندھیرے میں اس کا دم گھٹ رہا تھا چنانچہ وہ اپنا لکڑی کا ڈبہ اٹھائے اوپر چھت کی طرف بھاگی جا رہی تھی — بند کھڑکی کی سل میں گہرا دکھ پگھل پگھل کے جذب ہو رہا تھا — مٹی کی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی —)

"اوپر چلو اوپر —" اس نے حاجن مائی کا ہاتھ دبایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی — کھلی چھت پر دائیں طرف برساتی میں لوہے کی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی تھیں

ایک ہیٹی۔کے اوپر بسنت کا رنگ اُترا پنگھوڑا پڑا تھا ـــ اور سائیکل کے ٹائر اور چارپائیوں کی خالی چوکھٹیں ـــ اس نے بند کھڑکی کی طرف دیکھا ـــ اور ایک دم سناٹے میں آگئی۔ چیخ اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی ـــ

کانوں تک کٹے بالوں اور سفید فراک میں ایک چھوٹی سی لڑکی بند کھڑکی کے ساتھ سر لگائے کھڑی تھی ـــ چند لمحوں کے بعد گھبرا کر لڑکی نے سر اُٹھایا۔ بڑی بڑی سنہری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے ـــ اور جہاں سے اس نے سر اُٹھایا تھا ـــ بند کھڑکی کی بھوری لکڑی سے پانی کے قطرے بہتے ہوئے پھسل کر سیل میں جذب ہو رہے تھے اور نمی ہولے ہولے پھیل رہی تھی۔

اس کے قدم زمین پر گڑھ گئے ـــ تم کون ہو؟ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ اس نے کہنا چاہا، مگر لفظ مر چکے تھے ـــ

"پلی جاؤ آنٹے ـــ یہ مُنّی ہے ـــ معلوم نہیں کیا آنت ہے اس پر، سارا گھر چھوڑ کر یہاں آن بیٹھتی ہے ـــ"

گھر کی مالکن نے آگے بڑھ کے مُنّی کا بازو کھینچا ـــ

"چل نیچے ـــ"

مُنّی گھسیٹتی ہوئی چل دی ـــ مالکن کی ٹھوکر سے اور لٹین کا ڈبہ اُلٹ گیا، اور چوڑیوں، بٹنوں اور رنگین پنیوں کا انبار باہر زمین پر بکھر گیا ـــ

"ٹھہرو ـــ ٹھہرو ـــ یہ لیتی جاؤ" اس نے کہنا چاہا۔ مگر بند کھڑکی اس کی نگاہوں میں ثبت ہو گئی ـــ مٹی کے بادل چاروں طرف اُٹھ رہے تھے ـــ میں کہاں سے شروع کہاں ختم ہوتی ہوں ـــ؟ دنیا خلا میں بکھرتی نگاہ تھی ـــ

"مُنّی ـــ مُنّی ـــ اس کے ہونٹوں نے پُکارا ـــ مگر آواز کہاں تھی؟"

آخری سمت

کاندھے پر تولیہ ڈالے، برش پر منجن لگائے وہ بڑی تیزی سے کمرہ عبور کرنے کو تھی کہ یکدم کچھ تیکھے، اس کی گردن پر، نیچے کمر تک سر سرایا، جیسے بجلی کے بے شمار ننھے ننھے تاروں نے بڑھ کر چاروں طرف سے جکڑ لیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کچھ دیر پہلے بے معنی بڑی چیزیں کسی انجانے مفہوم کے رس سے بوجھل اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

نیلی دری پر سرخ دھاریاں، اور اس پر بچھا زرد اور سرخ پھولوں والا نیلا قالین، ٹیڑھی میڑھی بڑی آرام کرسیاں، دیوان پر بے ہنگم طور پر چھوڑے ہوئے فیروزی اور سرخ گاؤ تکیے، میز کے نیچے گوگی کی کوکا کولا ڈول، جس کا سر ڈھڑ سے جدا دروازے کے قریب پڑا تھا، اور بہت سے مٹی بھرے پتھر اور پاؤں تلے مسلے انگور سے چپٹے بے شمار چیونٹے ۔ جیسے سب کچھ اس ایک لمحے کے اہتمام میں تھا اور یہ تمام چیزیں اس ایک پل میں یوں نظر آنے کے لئے بنی تھیں۔

اس نے گھبرا کر کمرے سے نگاہیں ہٹالیں۔ تب اس کی نظریں اپنے قدموں پر جم گئیں۔ ایک پاؤں دہلیز پر، دوسرا سیاہ فرش کے سرخ حاشیے میں، کاندھے پر جھولتا زرد، سرخ اور بڑی ڈبیوں کا تولیہ اور ہاتھ میں نیلا ٹوتھ برش جس پر کلوروفل والی ہری ٹوتھ پیسٹ کی لمبی لکیر جمی تھی۔ ایک دہشت اسے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ گئی۔ وہ بھی کمرے میں بڑی چیزوں کے ساتھ خود بخود ایک مخصوص حالت میں آچکی تھی۔

اچانک اسے اپنے دیکھے جانے کا شدید احساس ہوا۔ یہیں کہیں، اسی کمرے،

میں کہیں بہت قریب کوئی نگاہ پھیلی تھی۔ یکدم ابا اپنے کمرے میں کھانسنے اور نیند میں ڈوبے گھر کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے کیساتھ اپنا پچھلا پاؤں دہلیز پار کرنے کو آگے بڑھایا۔ عین اسی وقت اس کی نگاہ کسی بڑی مانوس سی چیز سے پھسلتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر دیکھا، بڑے ابا کی نگاہیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

بڑے ابا کی یہ تصویر برسوں سے، جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس دیوار پر اسی طرح ٹنگی تھی۔ دھاریوں والا بند گلے کا کوٹ، رومی ٹوپی اور جھریوں بھرے چہرے پر آنکھوں سے نیچے نیچے ہونٹوں تک پھیلا دھیما سا کچھ مسکراہٹ ایسا تاثر۔ آج اس نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا کہ یہ مسکراہٹ نہیں تھی، بس جانی پہچانی چیز پر جو ملائمت سے ہوتی ہے۔ وہی تھی —— اور اس ملائمت سے اوپر گھیراڈالنے والی اداس آنکھیں۔ اس کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ کوئی طلسمی بوجھ اس پر آن پڑا اور اس کے قدم نیچے ہی نیچے فرش میں دھنستے چلے گئے۔ اسے، سوتے میں، دل پر اچانک اتر آنے والا بوجھ یاد آگیا، جیسے انسان منوں مٹی تلے دبتا چلا جائے اور ہاتھ پاؤں ہلنے کے باوجود نہ ہل سکیں۔ مگر وہ تو ہمیشہ بائیں پہلو پر بوجھ پڑنے سے ہوتا تھا۔ اسی لئے تو اماں دائیں کروٹ سونے کی تاکید کرتی تھیں اور آیت الکرسی اور تینوں قل اور جانے کیا کیا سینے پر دم کرنے کو کہتی تھیں۔ مگر اس وقت وہاں، اچھے خاصے جاگتے میں، اس پر منوں مٹی کا بوجھ اترنے لگا۔ خوف اور اداسی سے اس کا گلا رندھ گیا۔

اس نے بڑے ابا کی آنکھوں میں الجھا اپنی نگاہ کا تار چھڑانے کی کوشش کی۔ بڑے ابا، جو بھولی بسری کہانی سے بھی زیادہ بھولے بسرے تھے۔ ابا کبھی پہلے برسوں پہلے ان کی باتیں سنایا کرتے تھے اور تب بھی کبھی کوئی بات اس کے دل نہ لگی تھی۔ بنا وجود کے انسانوں کا تصور ہی اس کے ذہن میں کب آتا تھا۔ چنانچہ بڑے ابا کی یہ تصویر بالکل ویسی ہی تھی جیسے کبھی انگریزی کی عبارت میں

فرانسیسی کی سطریں آجاتیں اور نگاہیں فوراً ان سطروں کو چھوڑ کر آگے چل دیں۔ دن میں بیسیوں مرتبہ ہی تو وہ اس تصویر کے قریب سے گزرتی تھی، مگر آج تک بڑے آبا نے اس پر یوں نگاہوں کا جال نہ پھینکا تھا۔ اور یہ جواب اب ان کے نقوش میں گرم سی مانوسیت اُبھر رہی تھی۔ اس سے اس کا ذہن بالکل بکھر گیا۔ راز داری سے مُسکراتے ہونٹ اور اُداسی بھری اندر ہی اندر اُترنے والی آنکھیں جنہیں وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی مگر جو اس قدر مانوس تھیں گویا خود اسی کے وجود کا حصّہ ہوں۔

"سو جاؤ بیٹے، سو جاؤ۔" ابا نے جھنجھلا کر پکارا۔ تب اس کے ہاتھوں نے بڑھ کر بتی بجھائی اور جسم بستر پر گر گیا۔

مگر صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی اسے کسی سازش میں گھرنے کا احساس ہوا اور بستر میں پڑے پڑے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ تمام فضا آنکھوں بنا کی نگاہ بنی۔ اس کے گرد اگرد پھیلی تھی، جیسے کوئی چیونٹی شیشے کے گنبد میں قید ہو جائے۔ انی کے الیکٹرک شیور کی شوں شوں شروع ہو گئی، ابو نے ریڈیو سیلون لگایا، کھانے کے کمرے سے برتنوں کا شور اُٹھنے لگا۔

"اجی یہ شیطانی چرخہ دھیما کرو۔" اماں نے کوٹھری میں سے پکارا ان کا سورہ یٰسین کا ورد تاروں کی چھاؤں سے شروع ہو کر ناشتے کے وقت تک جاری رہتا تھا۔ ابو نے ذرا دیر کو ریڈیو دھیما کیا اور پھر اونچا کر دیا۔

"اجی ــ سہگل" اس نے دروازے میں آکر نعرہ لگایا۔

"تربیت بتیس دن رہیں" سہگل کی آواز سے پھر اس کا رواں رواں کانپ اٹھا، جیسے شدید درد سے جسم کے روئیں کھڑے ہو جائیں۔ ایک عجیب سی بے بسی کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے تصویر کی طرف دیکھا اُداسی بھری نگاہیں اسی طرف اس پر لگی تھیں۔

"ارے اُٹھتی ہے کہ نہیں، پھر جو بج ایسے بال لئے کالج چل دے گی۔

حد ہے ایمان سے۔" افی نے شیو بنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اس کے سر تلے سے تکیہ گھسیٹ ڈالا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، صرف آدھ گھنٹہ۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور پاؤں سے پلنگ کے نیچے سلیپر ٹٹولنے لگی۔ جب وہ گیلری میں سے گزری اپو بالوں میں چٹلا ڈالتے ہوئے "بربت بیتیں دن رین،" گنگنا رہی تھی۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں، تیزی سے، بالوں کے تینوں لڑوں میں بل ڈالے چلی جا رہی تھیں۔ وہ اس کے قریب رک گئی۔

"کیوں کیا ہے؟" اپو نے گھوم کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ غسل خانے کی طرف چل دی۔ دراصل اس وقت اس کا جی کسی کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کے رونے کو چاہ رہا تھا۔

یہ عجیب دن طلوع ہوا تھا کہ ہر چیز خود بخود کسی مقررہ حالت میں ڈھلتی جاتی تھی، جیسے پہلے سے بنے بنائے خاکوں میں پل پل رنگ بھرتے چلے جائیں ایک ذرا بھر رنگ بھی خاکے سے اِدھر اُدھر نہ نکل سکتا تھا۔ وہ اپو کے ساتھ برسوں کے روندے ہوئے راستے پر چپ چاپ چلی گئی۔ مگر بسیں، سکوٹریں، ٹانگے، سائیکلیں، گاڑیاں اور پھر انسان ــ سب کے سب جانے کن کن کونوں کھدروں سے نکل کر آج، اس لمحے، محض اس کے قریب سے گزرنے، اسی کے سامنے کو چلے آ رہے تھے۔ ہر چیز کوئی انجانا وعدہ نبھانے میں مصروف تھی۔

کالج کے گیٹ پر روز کی طرح کاروں کا ہجوم تھا اور چوکیدار اللہ بخش سٹول پر گیٹ کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

"میری گاڑی ہے۔ تین چار تین دو نمبر ہے۔ یہ تھرمس دے دینا۔" اودی قمیض دوپٹے اور کانوں میں جھولتے سفید بندوں والی ایک لڑکی چوکیدار کو سمجھا رہی تھی۔ سرخ اور زرد دھاریوں والا تھرمس اللہ بخش نے کھاٹ پر رکھ لیا اور لڑکی ہال کی طرف بھاگ گئی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی ــ چلو بھی اب۔" اپو نے جھنجھلا کر کہا اور اللہ بخش

ہنسنے لگا۔ سامنے سے مائی چندہ دانتوں میں خلال کرتی چلی آتی تھی۔

"چلو بٹیا گھنٹہ شروع ہوگیا۔"

اس نے جھنجھلا کر آگے قدم بڑھایا۔ مگر پھر رک گئی۔

"میں واپس بھی تو جا سکتی ہوں۔" اس نے کسی انجانی یا بندی کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ابو آنکھیں پھاڑ کے دھاڑی۔

"میرا مطلب ہے کہ میں اگر چاہوں تو سامنے ہال کی طرف جانے کی بجائے گیٹ کی طرف مڑ سکتی ہوں۔"

اللہ بخش اور چندا زور سے ہنس دیئے اور وہ ڈر کے مارے ابو کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

"یا خدا! کیسی منحوس صورت لئے چلی آرہی۔" جب وہ گھر لوٹی تو انی بڑے اطمینان سے فرش پر آلتی پالتی مارے اپنے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ سامنے براؤن اور کالے پالش کی ڈبیاں، برش اور جھاڑن بکھرے پڑے تھے۔ پالش کی تیز بو پھیلی تھی اور گوگی اباکے سلیپر پہنے آئینے کے سامنے کھڑی آپ ہی آپ ہنسے چلی جا رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک گئی، جیسے کسی سجائی اسٹیج پر داخل ہو رہی ہو۔

"انی تم اس وقت بوٹ کیوں پالش کر رہے ہو، اس طرح بیٹھے؟"

اس نے اس کے قریب ہو کر رازداری سے پوچھا۔

"ارے کیا بے سری بول رہی ہے — ہیں؟ خود ہی تو کیا کرتا ہوں پالش۔ دیکھ شکل بھی نظر آتی ہے اس میں۔ دیکھا؟" اس نے بوٹ کی ٹو اس کی ناک کے نیچے گھسیڑی۔

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ"، اس نے بے وجہ آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو پی کر کہنا شروع کیا، "میرا مطلب ہے کہ اگر تم چاہو

تو یوں کر سکتے ہو نا۔"

"انانا۔۔ ارے چل ۔۔ جا کے کھانا وانا کھا۔ دماغ چل گیا ہے۔"
وہ فرش پر لیٹ کر مخصوص قہقہوں کے ساتھ ہنسنے لگا۔

"ارے چپکے رہو جی، ظہر کی آذان ہو رہی ہے۔" اماں نے دالان میں سے پکار کر کہا۔

پھر کھانے کے بعد وہ اماں کے پاس زمین پر لیٹ گئی۔ اس کے اندر عجیب بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور جسم بالکل بے جان سا ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے بی بی۔ کھانا کھایا؟" اماں نے کروشیا چلاتے چلاتے، ناک پر ڈھلک آنے والی عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"اماں ۔۔ یہ جو بڑے آبا کی تصویر ہے نا ۔۔ دیوار پر ۔۔" اس نے بیٹھ کر کہا۔

"ہاں۔ تجھے کیا پتا بڑے آبا کا۔"

"ہاں پتا تو نہیں، مگر ان کی آنکھیں ہیں نا ۔۔ دیکھتی ہیں بالکل۔"

"ہیں ۔۔ دیکھتی ہیں؟" اماں نے پریشان ہو کر شیشوں کے اوپر سے جھانکا۔

میرا مطلب ہے کہ جس طرف جاؤ پیچھا کرتی ہیں"۔ اور اماں زور سے ہنس دیں۔

"تصویر کی آنکھ ہمیشہ اسی طرح پیچھا کرتی ہے۔"

"اچھا۔" وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔ اب وہ اماں کو بھلا یہ کیسے بتاتی کہ جب تصویر کے سامنے نہ ہوں تب بھی یہ آنکھ پیچھا کرتی ہے، جیسے چپکے چپکے ہر لمحے، ہر حرکت پر رازداری سے مسکراتی ہو اور وہاں ٹھنڈی زمین پر لیٹے لیٹے ایک دم اپنی نظر بندی کے احساس نے اسے جکڑ لیا اور اس کے بعد سے ایک انجانی خواہش کا غبار اس کے اندر اٹھتا۔ وہ فوراً رک جاتی اور

اس سے بالکل الٹ کام کرنے لگتی۔ اس شام اپوا ماں کے ساتھ بازار گئی تھی اور وہ انی کے ساتھ پکچر دیکھنے جا رہی تھی۔

"کون سی دیکھے گی ـــ پلازا والی کہ اوڈین والی؟"

"پلازا والی۔"

مگر جب وہ سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر، انی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر، بیٹھی تو یکدم ایک عجیب بے چینی اور خوف نے اس کو گھیر لیا۔ انی سے آتی ہوئی آفٹر شیو لوشن کی خوشبو، بالوں سے ڈھکی کلائی پر چھ بجاتی گھڑی، کفوں پر لگے سلیٹی کف لنک، سڑک پر سے گزرتی ڈبل ڈیکر جس کی اوپر کی منزل سے ایک گول مٹول سی بچی سرخ ربن باندھے گھوم گھوم کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ بنے بنائے خاکے میں خود بخود خانہ پری ہو رہی تھی۔ ایک اتھاہ اداسی اس کے دل سے اٹھی۔

"انی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہوں؟" اس نے پلازا کے گیٹ پر سکوٹر کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا، "چل اتر"

"انی ـــ اوڈین چلو ـــ یا پھر گھر۔"

"ہیں؟" وہ آنکھیں پھاڑ کے چلایا۔

"ہاں۔ دیکھو نا ہم یوں بھی تو کر سکتے ہیں کہ یہاں نہ آئیں، لوٹ جائیں کر سکتے ہیں نا۔ یہ تو نہیں نا کہ نہیں کر سکتے۔"

"اور تیرا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں۔ گھونٹ سکتے ہیں نا؟" انی نے سکوٹر کا رخ گھر کی طرف موڑتے ہوئے کہا اور غصے میں آ کر سکوٹر کی رفتار بے حد تیز کر دی۔ چلتی گاڑیوں اور ساکت مکانوں اور درختوں کے قریب سے اتنی تیزی کے ساتھ گذرتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ کسی قید سے چھوٹ کر آئی ہو۔ آزادی کے اس احساس سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کا جی چاہا راہ چلتے لوگوں اور گاڑیوں اور مکانوں میں

مصروف انسانوں اور سینما گھروں میں تماشائیوں اور جہاں جہاں کوئی ہے ــــ تمام دنیا کو موجودہ لمحے اور اس کی سمت سے نجات دلا دے۔ اگر واقعی سب لوگ اپنی راہوں سے لوٹ جائیں، کسی اور ہی سمت کو، تو ابھی ایک لمحے میں سب کچھ بدل جائے، بنے بنائے خاکے میں بھرے جانے والے رنگ بنا سمت کے بہنے لگیں۔

لہذا اب کوئی بات کرتے کرتے رک کو خاموش ہو جانے، یا پھر راہ پڑی چیزوں کی جگہ تبدیل کر دینے، کسی جانب کو چلتے یکدم پلٹ آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اور کئی دفعہ تو کسی حرکت کے کرنے نہ کرنے کے تذبذب میں وہ دیر تک ساکت بیٹھی رہتی۔

"ارے خبطن!" افی جانے کہاں سے بھوت کی طرح اسے جھانک لیتا۔ یہ افی ہمیشہ بنا بنایا کام بگاڑتا تھا۔ ایک تو اس کی آواز ایسی بھاری تھی کہ دھم سے آ کر جم ہی تو جاتی اور آزادی سے گھومتی پھرتی۔ چیزیں ایک دم سے زمین کے ساتھ چپک جاتیں۔ بالکل چپٹے خاکے۔ اب اسے ساری صورتِ حالات سمجھانا کچھ اس کے بس کی بات تو تھی نہیں۔

مگر جانے کیا بات تھی، کچھ ہی دنوں میں، اسے یہ سب کچھ بے کار سا لگنے لگا۔ ایک تو بڑے ابا کی آنکھیں کچھ اس طرح اداسی سے مسکراتی تھیں جیسے ان تمام دھندوں کے بے کارپن سے واقف ہوں۔ اس روز وہ کالج میں اپنی آنکھوں کے گھیرے میں دم بخود سی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی فہمیدہ بڑی تیزی سے تاریخ کے نوٹس نقل کر رہی تھی۔ یکدم تیزی سے چلتی پنسل کی نوک ٹوٹ گئی۔ اور چھوٹا سا سیاہ سکہ ٹوٹ کر ڈیسک کی دراز میں گر گیا۔ وہ ایک دم اچھل پڑی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بھئی ــــ پنسل کی نوک ٹوٹ گئی۔ کیا مصیبت ہے ــــ قسلم ہے؟"

"اس وقت کیوں ٹوٹی ہے پنسل کی نوک؟" اس نے اپنے گرد

پھیلے منظر کو دیکھ کر پوچھا۔
"نہیں ؟" فہمیدہ نے بے دھیانی سے کہا اور پھر اس کے قلم سے لکھنے لگی۔
"فارغ ہو؟ کچھ دیر بعد فہمیدہ نے قلم واپس کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں ۔"
"پروین نہیں آئی آج ؟"
"نہیں ۔"
"چلو آج ہمارے یہاں ، روز وعدہ کرتی ہو۔"
"نہیں ، گھر جانا ہے مجھے ۔"
"اچھا۔" فہمیدہ جھک کر کتابیں سمیٹنے لگی اور پھر وہ دونوں خاموشی سے گیٹ کی طرف چل دیں۔ مگر سڑک پر پہنچ کر وہ چلتے چلتے رک گئی۔
"میں چلوں گی تمہارے ساتھ ۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ابا کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا جو اسے بغیر اجازت کہیں آنے جانے سے اتنی سختی سے منع کرتے تھے ، اور پھر افی ، جو کچھ دنوں سے اسے معلوم نہیں اتنی مشکوک نگاہوں سے کیوں دیکھنے لگا تھا اور ہر وقت طرح طرح کی جاسوسیاں کرتا پھرتا تھا، اور پھر اماں ، جو کسی کو پل بھر دیر ہو جاتی تو آیت الکرسی پھونک پھونک کر باؤلی ہو جاتیں ۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک سرشاری اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بس اسٹاپ پر اچھلتے دل کو سنبھالے کھڑی رہی ۔ فہمیدہ اس سے جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی ۔
"آج تو اتنی ٹھنڈ ہے ۔ کتنا پسینہ آتا ہے تمہیں !" فہمیدہ نے اپنی بھوری آنکھوں سے اس کی پیشانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں بس یونہی ۔" اس نے ہولے ہولے کانپتے ہاتھوں سے پیشانی پونچھی۔
بس میں قدم رکھتے ہی اس خیال سے اس کا جی باؤلا سا ہو گیا کہ سب کچھ کہیں دور ، بہت پیچھے رہ گیا ۔ آج تو لوگوں کے ہجوم گھستے ہوئے بھی اس

کا دل نہ گھبرایا۔ تین نمبر بس میں وہ یوں بھی پہلے کبھی سوار نہ ہوئی تھی۔ ہر راستہ، ہر چیز نئی تھی۔

"چلو" فہمیدہ نے اسے ٹھونکا دیا۔

اور وہ تیزی سے نیچے سڑک پر اتر گئی۔ اس کے سامنے ایک کچا راستہ پھیلا تھا جس پر بے شمار قدموں اور پہیوں کے نشان جمے تھے۔ ابھی ابھی جانے کیا گزر کے گیا تھا کہ گرد اُڑ رہی تھی۔ مٹی کی دم گھونٹتی خوشبو ہر طرف پھیلی تھی۔ اُدھر سامنے سے نیلے فراک پہنے، گلوں میں بستے ڈالے چھوٹی چھوٹی بچیاں کاغذ کی پڑیا میں سے املی کھاتی چلی آ رہی تھیں۔

"سکول ہے ادھر بچّوں کا" فہمیدہ نے بچیوں کو دیکھ کر اسے بتایا۔

کچھ دور جا کر کچا راستہ پکی سڑک کے ساتھ مل گیا اور سامنے ایک سے سرخ سرخ، سفید دروازوں والے مکان شروع ہو گئے۔ فہمیدہ ایک ایسے ہی کھلونا سے مکان کے دروازے پر رک گئی۔

"یہ ہے" اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر میں دروازہ کھلا۔ ملیشیا کی نیکر پہنے ایک چھوٹا سا لڑکا سامنے کھڑا تھا۔

"آؤ، اِدھر آ جاؤ" چھوٹی سی روشن ڈیوڑھی میں سے فہمیدہ اُسے بائیں ہاتھ کھلنے والے دروازے کے اندر لے گئی جہاں سرخ پھولوں والی زرد جاجم پر چار آرام کرسیاں آمنے سامنے رکھی تھیں اور بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز پر پیتل کے گلدان میں گلاب کے کاغذی پھول سجے تھے۔ سامنے دیوار پر ہلال انڈسٹریز اور جدید اُردو پریس کے کیلنڈر لٹکے تھے اور دائیں طرف کی دیوار پر اقبال کی تصویر۔

"کون ہے فہمی؟" برابر کے کمرے سے کانپتی سی آواز آئی۔

"کوئی نہیں" فہمیدہ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا، ابا سے ملو گی؟ آ جاؤ پانچ منٹ کے لئے۔ امی بھی وہیں بیٹھی ہیں۔ باقی سب تو ابھی

آئے نہیں گھر"۔

تب بے خبری ہی میں وہ دہلیز پار کر کے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ پل بھر کو اندھیرے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ پھر دروازے کے بالکل سامنے، دیوار کے ساتھ چینی کے برتنوں سے سجی الماری رکھی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ رنگین شیشوں جڑی پشت والا بڑا سا پلنگ کی طرف دیکھتے ہی اس کے تمام جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ آداب کے لئے ماتھے تک اٹھتا اٹھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"اچھا۔ اچھا۔" ایک کھلے ہوئے جسم کے ہاتھوں نے پلنگ کی پٹیوں کو پکڑنے کے اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لیٹے رہیئے ــــ ہلا تو جاتا نہیں۔ آؤ بیٹا، بیٹھو۔" پلنگ کے قریب موڑھے پر بیٹھی فہمیدہ کی امّی نے سر پہ جالی کا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"انجم ہیں یہ۔" فہمیدہ نے پلنگ پر جھک کر کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔" ہڈیوں کے ڈھانچے نے بری طرح کانپتے ہاتھ بالوں پر پھیرتے ہوئے کہا اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ خود بھی کاغذ کی طرح کانپنے لگا۔ وہ گہری گہری لکیروں سے پٹے مٹی سے چہرے کو دیکھنے لگی۔ جس پر بڑی بڑی آنکھیں جانے کیسی بھوک میں سلگ رہی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آنکھیں اس جسم کی نہ ہوں، اور اس خیال سے اس کا جی ڈھینے لگا۔ ٹھنڈی راکھ میں سلگتی دو چنگاریاں جن میں ہر چیز چاٹ جانے والی آگ بھری تھی! اس کے تمام جسم پر کچھ سرسرا اٹھا، جیسے بجلی کے بے شمار ننھے ننھے تاروں نے بڑھ کر اسے جکڑ لیا ہو۔ چیخ روک کر وہ کرسی سے اٹھ گئی۔

"بیٹھو بیٹا بیٹھو۔ تمہارا وہ مضمون پڑھا تھا میں نے۔ ہاں۔ میں بھی لکھتا تھا نا۔ بڑا جنون تھا۔ اور مضمون بھی دینا پڑھنے کو۔ اچھا۔ بڑا شوق تھا تم سے ملنے کا ــــ اچھا۔ اچھا۔"

پلنگ کی کانپتی پٹی اس کے گھٹنے سے چھو گئی اور متلی کے نیلے پیلے اندھیرے اس کے گرد گھومنے لگے۔

"بس زیادہ بات نہ کیجئے۔ دیکھیے رعشہ تیز ہو رہا ہے"۔ فہمیدہ کی امی نے لاتعلق سی آواز میں کہا، اور بے طرح کھلی ہوئی آنکھوں میں بے بسی جم سی گئی۔ پھر کانپتا ہوا جسم پلنگ کے ساتھ چپک کر ایک ہو گیا۔

"اب چلوں"۔ اس نے بمشکل اپنے گلے سے آواز نکالی۔

"ارے ٹھیرو۔ کھانا تو کھا لو۔ چلو اُدھر کمرے میں"۔ فہمیدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا، مگر متلی کے تیرتے اندھیروں میں وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ آتے ہوئے اس نے پل بھر کو پلٹ کر دیکھا، کسی انجانی بھوک اور اداسی میں سلگتی آنکھیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

جب وہ گھر پہنچی امّاں دروازے میں کھڑی تھیں اور رافی سکوٹر لئے کہیں جانے کو تیار تھا اور ابو سے جانے کیسی کیسی تفتیش کر رہا تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں"۔ اسے آتا دیکھ کر وہ سختی سے بولا۔

"کہیں نہیں۔ فہمیدہ کے ساتھ گئی تھی"۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

"اِدھر تو آ ___ بات تو سن ___" وہ اُسے پکارتا رہ گیا۔

مگر اس وقت اس کے جسم کا ہر رواں بے آنکھ کی نگاہ بن چکا تھا۔ اور اس کڑی نظر بندی میں وہ سب کچھ بھولتی جا رہی تھی۔ بڑے ابا کی نظریں اپنی دُور دُور جانے کاہے کو پھیلی تھیں جب کہ ان کا اس سے کسی بھی چیز سے کچھ بھی تعلق نہ تھا!

اس کے کچھ روز بعد ہی جب فہمیدہ چار دن کی چھٹی کے بعد کالج آئی تو اس نے بے حس آواز میں کہا:

"آخری وقت میں جانے ابا نے 'تم' کو اتنا یاد کیوں کیا؟"

اس نے بے بسی سے سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ اور اپنی راہ سے پلٹ جانا چاہا، مگر پلٹی ہوئی سمت ہی کسی اٹل خا کے کی لکیر تھی!

سَواری

سُورج ڈوب رہا تھا اور مجھے شہر پہنچنے کی جلدی تھی۔ کچا راستہ عبور کر کے میں پُل پر ہولیا ـــــ دور ـــــ راوی کی مٹی میں سورج اتر رہا تھا۔ بس اَب جلتے تانبے سا کنارا رہ گیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اس کنارے کو دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ مگر کچھ دور جا کے مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے کچھ دیکھا ہے۔ اس لئے میں مڑا اور میں نے پل کے جنگلے پر جھکے وہ تینوں شخص دیکھے۔ وہ تینوں سامنے دریا کی دلدل میں اترتے سُورج کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی سورج کی جانب دیکھا مگر کچھ نہ پاکر پھر ان تینوں کے چہروں کی طرف نگاہ پھیری۔ اِن تینوں کی شکلیں مختلف تھیں جیسے ہم سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی شخص تین بن کر کھڑا ہو۔ ان کے کپڑے اونچے طبقے کے دیہاتیوں کے سے تھے اور جوتوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں جیسے وہ میلوں کا سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں۔ اسی لمحے کی خاطر ـــــ سو کھتے راوی کی دلدل میں اُترتے سورج کو دیکھنے۔ اور اب وہ گہرے انہماک سے، سڑک پر آتی جاتی بھاری ہلکی سواریوں اور انسانوں سے بے خبر اس سرخ ہوتی دلدل پر نگاہیں جمائے تھے۔ میں بھی پل بھر کو انکے قریب رک گیا۔

اَب سورج چھپ چکا تھا اور زمین سے ملتے آسمان پر گہری سُرخی پھیلی تھی۔ یکدم اِن تینوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں دیکھا اور پھر

ان کے سر جھک گئے۔ پھر خاموش ہی وہ شہر کی دوسری سمت مضافات کو لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا انہیں مضمحل قدموں سے لوٹتا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے شہر میں جاگتی رات کی آوازوں نے چونکایا۔ اب پھیلتی رات کے نیلے دھوئیں میں بتیاں ٹمٹمانے لگی تھیں اور مجھے یاد آیا کہ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے چنانچہ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

اگلے روز جب میں سوکھتے راوی کے پل سے گزرا تو ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر تھی۔ سورج کو دیکھ کر مجھے ان تینوں کا خیال آگیا اور میں بغیر ارادے کے جنگلے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے خیال بھی آیا کہ جلدی گھر پہنچنا ہے۔ منا ڈیوڑھی میں کھڑا ریوڑیوں کا انتظار کر رہا ہو گا اور زکیہ سینما کے لئے تیار ہو گی۔ پھر بھی لمحہ بھر کو وہاں رک گیا۔ غروب کا وقت قریب ہی تھا۔ اگلے دن مجھے رات بھر یہی خیال ستاتا رہا کہ وہاں دریا کی دلدل اور سورج کے تانبے میں کیا تھا کہ وہ تینوں اس انہماک سے اسے دیکھتے تھے۔

اب روشنی مدھم پڑ رہی تھی اور سورج کا نارنجی دمکتا تھال زمین کی طرف اتر رہا تھا۔ مگر عین غروب کے وقت دیہات کی سمت سے تین شخص آتے دکھائی دیے۔ ایک سے قد، ایک سی چال اور لباس۔ جب قریب پہنچے تو وہی اگلے دن والے شخص تھے۔ وہ پھر چپ چاپ آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور اسی انہماک سے ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ تینوں کی آنکھیں کوئلے کی طرح دہکتی تھیں اور ان کوئلے کی طرح دہکتی آنکھوں میں ایک سی اداس چپ بھری تھی۔ اب پھر مجھے حیرت ہوئی کہ مختلف خد و خال رکھنے کے باوجود یہ تینوں ایک سے کیوں لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص خاصا معمر تھا اور اس کا چہرہ گھنی سفید داڑھی میں چھپا تھا۔ دوسرے کا رنگ اپنے دونوں ساتھیوں کی نسبت صاف تھا اور ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں کندن کی طرح دمکتا تھا۔ اس کے بال جھالر کی صورت گردن پر پڑے تھے۔

اور ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا۔ تیسرا پہلے دونوں کی نسبت سیاہ فام تھا اور بے حد چپٹی ناک رکھتا تھا۔ میں انہیں غور سے دیکھتا رہا اور اسی اثنا میں سورج ڈوب گیا۔ پھر ان تینوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا اور پھر اپنے راستے پر لوٹ گئے۔

اس رات میرا جی کسی کام میں نہ لگا اور میں پچھتایا کہ آخر میں نے ان سے پوچھا کیوں نہ کہ وہ سوکھتے راوی کی دلدل میں اترتے سورج میں کیا ڈھونڈنے آتے ہیں۔ میں نے ذکیہ سے ان تینوں کا تذکرہ کیا۔ مگر ذکیہ ہنس کر خاموش ہو رہی۔ "یونہی کوئی دیہاتی شہر کی سیر کو آئے ہوں گے"۔

میں نے سوچا کہ ذکیہ غلط بھی نہیں کہتی۔ جب تک کوئی ان تینوں کو دیکھے نہیں ان کے اسرار کا احساس نہیں کر سکتا۔ اگلے روز تمام دن مجھے شام کا انتظار رہا۔ غروبِ آفتاب کے وقت میں جنگلے پر کھڑا ان کی راہ دیکھنے لگا۔ عین روشنی کے ڈھلتے وہ تینوں اسی طرح ایک سی چال چلتے جنگلے پر آن رکے اور آتی جاتی سواریوں اور انسانوں کے شور سے بے خبر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے کے عمل میں وہ یوں محو رہتے تھے کہ اس کے درمیان ان سے بات کرنا ناممکن لگتا تھا۔ چنانچہ میں سورج کے پوری طرح ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا اور سوچا کہ جب یہ تینوں اپنے راستے پر مڑیں گے تب میں ان کا پیچھا کروں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور ڈوبتے سورج اور سوکھتے دریا کی دلدل اور شام کے لمحے میں کیا ڈھونڈتے ہو؟

جب سورج پورے کا پورا ڈوب گیا تو ان تینوں نے پھر گنگ اداسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لئے۔ اور میں اس بات کا منتظر ہوا کہ اب یہ اپنی راہ لیں اور میں انکے پیچھے ہو لوں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ واپس اپنی راہ پر لوٹنے کی بجائے وہ شہر کی سڑک پر ہو لئے۔ ان کی جوتیوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں اور ان کے قدم ساتھ ساتھ اٹھتے تھے۔

آخر میں ہمت کر کے اُن سے مخاطب ہوا اور میں نے پوچھا:

"بھائیو ! تم کس گاؤں سے آئے ہو؟"

چپٹی ناک والے نے گھوم کر مجھے دیکھا اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"وہاں پل پر کیا دیکھتے ہو؟" اب ان کے اسرار سے میرا جی بوجھل ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں ـــــ سارے جسم میں پگھلا سیسہ اُتر رہا ہے اور میں ابھی چکرا کے گر کر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی نقش دیوار کی مانند خاموش رہے۔ اب کے میں نے چلّا کر ان سے بات کی اور میری آواز بھرّا گئی اور آنکھیں جلتے پانی سے بھیگ گئیں۔

"اس سورج کو کیوں دیکھتے ہو؟" میں نے ان کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی کیونکہ اب وہ نہایت تیزی چلنے لگے تھے۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی خاموش رہے۔ اب شہر کی سڑک قریب تھی اور سواریوں کی ریل پیل تھی۔ مصروف رات کی آوازیں بہت قریب آ گئی تھیں اور ہوا میں جاتے اکتوبر کی خنکی تھی۔ کہیں سے چنبیلی کی مہک لہر بن کر آئی تھی اور ہم محصول چنگی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک معمّر شخص نے، جس کے بال برف کی طرح سفید پڑ چکے تھے کہا:

"کیا تم نے نہیں دیکھا؟ کیا اس شہر کے کسی شخص نے نہیں دیکھا؟"

"کیا؟ کیا نہیں دیکھا؟"

"جب سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے!" معمّر شخص نے چادر کی بُکل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے! وہ تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ بلکہ نہیں دیکھتے کیونکہ سورج روز ہی ڈوبتا ہے"۔ میں نے تیزی سے کہا کہ وہ مبادا شخص پھر خاموش ہو جائے۔

"ہم جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا - اسی لئے ہم آئے ہیں - یہ پچھلی بستی بھی"۔
معمّر شخص نے مشرق کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔
"ہاں جہاں سے ہم آئے ہیں ——" چپٹی ناک والے نے کہا۔
"کہاں سے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ"
اس پر درمیان کے شخص نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان پہلے سے بھی گہرا نظر آرہا تھا۔
"ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ سورج روز چڑھتا ڈوبتا ہے۔ اس لئے ہم نہیں دیکھتے۔ اسی لئے جب اُدھر (اس نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا) سورج ڈوبنے پر سُرخی لہو کی طرح گہری ہونے لگی اور رات کے اندھیرے میں بھی اپنی گہری آگ کی طرح دہکتی رہنے لگی تو ہمیں خبر تک نہ ہوئی اور پھر ——" وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے اس کا گلا رندھ گیا ہو۔
"یہ سرخی بستی بستی پھیلتی ہے۔ ایسی سرخی میں نے کبھی اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ نہ ہی میرے بزرگوں نے اور نہ ہی ان کے بزرگوں نے کبھی اپنے بزرگوں سے کوئی ایسی بات سُنی تھی۔ اس سے پہلے کا پتہ نہیں"۔
اس پر میں نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دریا پر پھیلتے آسمان کو دیکھا۔ اندھیرا خوب سا گہرا ہو چکا تھا اور سڑکوں کی زرد بتیاں ٹمٹماتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی صورتیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ سوائے ان کے سفید کپڑوں یا پھر ان کے دھندلے چہروں کے جب وہ کسی بجلی کے کھمبے تلے گزرتے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ اس اندھیرے میں بھی آسمان کا وہ ٹکڑا آگ کی طرح دہکتا تھا۔
"ہاں واقعی —— ہم نے نہیں دیکھا" میں نے حیرانی چھپانے کی کوشش کی۔
"اب تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ہم یونہی شہر کو جا رہے ہیں۔ بعد میں آنے کا کیا فائدہ۔"

میرا جی چاہا ان لوگوں کے ساتھ رہوں۔ انہیں اپنے گھر لے چلوں۔ مگر وہ اچانک ہی دوسری سڑک پر مڑ گئے اور مجھے یاد آ گیا کہ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ منا ڈیوڑھی میں ریوڑیوں کے انتظار میں کھڑا ہو گا۔ اور ذکیہ انتظار کرتے کرتے بیزار ہو چکی ہو گی۔

اس سے اگلے روز میں سوکھتے راوی پر رُکا اور سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہا۔ پورے کا پورا سورج چھپ گیا مگر ان تینوں کا آج کوئی پتا نہ تھا۔ پہلے میں بے چینی سے ان کا منتظر رہا۔ مگر پھر ڈوبتے سورج کی سرخی میں محو ہو گیا۔ آسمان پر گویا لہو کی چادر تنی تھی۔ پھر اچانک اس لہو کی چادر کے سامنے تنہا کھڑے کھڑے مجھے خوف آنے لگا۔ اپنے پیچھے —— بالکل پیچھے —— شالوں کی ہڈیوں کے درمیان مجھے کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ کوئی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہ تھا —— مگر غلط ہے —— میں نے پیچھے دیکھا ہی کب؟ میں اپنے پیچھے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ نہیں دیکھ سکتا اور میرے پیچھے کوئی موجود ہے۔ میرے اندر یا شاید مجھ سے الگ۔

سواریاں اپنے راستے پر چلی جاتی تھیں۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اور پھیلتی رات میں آسمان کا وہ ٹکڑا لہو کی چادر بنا دہکتا تھا اور اس کی آنچ دُور دُور کے اندھیروں تک پہنچتی تھی۔ خوفزدہ ہو کر میں گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچتے ہی میں نے ذکیہ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ وہ میرے وہم پر ہنس دی۔ مگر میں اسے چھت پر لے گیا۔ رات کی تاریکی میں بھی وہ سرخی چمک رہی تھی۔ ذکیہ کچھ خاموش سی ہو گئی، پھر بولی:

"کوئی آندھی آتی ہو گی۔"

اگلے روز میں دفتر میں فائل پر جھکا تھا کہ مجیب اللہ نے حفیظ احمد سے کہا:

"یار آج کل سورج چھپنے پر دیکھا ہے آسمان کیسا سرخ ہوتا ہے۔ اندھیرے

میں بھی باقاعدہ سُرخ رہتا ہے“۔

اس پر مجھے یوں لگا جیسے میں اکیلا اس چادرِ خوں کے سامنے کھڑا ہوں اور مارے خوف کے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور شام قریب آتی گئی میرے دل میں عجیب دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ میں سوکھتے راوی اور پل اور آسمان اور سورج سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ ان کا خوف میرے اندر پھیل رہا تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ آسمان کے لہو کی دلدل اور ان تینوں شخصوں کی کشش بھی مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا میں اپنے ساتھیوں سے ان تینوں دیہاتیوں کا تذکرہ کروں کہ اس لہو رنگ شام کی آمد کے ساتھ ساتھ تین دیہاتی بھی، جو مختلف صورتوں کے باوصف ایک سے تھے، اس شہر میں اترے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے یہ سرخی دکھائی تھی اور دکھا کر خود ایک سڑک پر گھوم گئے اور شہر کی بھیڑ میں گم ہوگئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی بستی بستی اس لہو رنگ شام کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ میں نے انہیں شہر میں بہت ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام و نشان نہیں۔

مگر مجیب اللہ اور حفیظ احمد دونوں مجھ سے بات کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ عرصہ ہوا ان دونوں نے مجھ سے دس بیس روپے قرض لیے تھے جو نہیں لوٹائے تھے اور اب وہ مجھ سے پرخاش رکھتے تھے۔

چنانچہ میں خاموش رہا اور گھر لوٹتے ہوئے جب پُل پر پہنچا تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور ڈوبتے سورج کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں اور شہر کی سڑک کو بغور دیکھتا رہا۔ مگر پھر بھی وہ لہو رنگ شام میرے ساتھ ساتھ چلتی ——— آگے پیچھے پھیلتی ——— سانس لیتی جھکتی چلی آتی تھی۔ میرے سامنے پھیلے شام کے پھیکے اندھیرے میں کجلائے آسمان پر سیاہ پرندوں کی ٹولیاں آٹھ کے ہندسے کی شکل میں اُڑتی جاتی تھیں۔ ان کی طرح میں بھی اپنے ٹھکانے کو لوٹ رہا تھا ——— ٹھکانا کہ جو اب محفوظ نہ رہا تھا۔ کیوں کہ لہو رنگ شام اس کی کھڑکیوں، دروازوں، ٹھوس دیواروں میں سے بہہ بہہ کر اسے اپنے آپ سے بھر رہی تھی۔

اَب میں رات گئے تک شہر میں گھومتا۔ ہر قسم کی دُکان میں جھانکتا کہ شاید کہیں وہ گردِ آلود جوتیوں اور سفید چادروں کی بکلوں میں چھپے دیہاتی نظر آجائیں اور میں ان سے پوچھ پاؤں کہ یہ سُرخی کہاں سے آتی ہے اور اس کے آنے کے بعد کیا آتا ہے؟ تم پہلی بستی کیوں چھوڑ آئے۔ اور اب وہ کس حال میں ہے؟ مگر مصروف تیز رفتار کلبل کلبل کرتے شہر میں کہیں ان کا نام و نشان نہ تھا اور اہلِ شہر تجارت میں کمال منہمک تھے۔

مگر کچھ ہی دنوں بعد شہر میں شام کے وقت میں نے کچھ آدمیوں کو مغرب پر پھیلتی سُرخی کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ معلوم نہیں یہ سرخی کی اطلاع چند ہی دِن میں کیوں کر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ میں نے تو سوائے ذکیہ کے اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر سب نے اس خونچکاں آسمان کو کیوں کر دیکھ لیا؟ اس پر مجھے خیال آیا کہ وہ دیہاتی یقیناً شہر میں موجود ہیں۔

اَب ہر جگہ اس سُرخی کے چرچے تھے۔ چودھری صاحب میرے پرانے واقف کاروں میں سے ہیں اور مزنگ کے چوک میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ شام گئے ان کے یہاں دوست احباب کی صحبت رہا کرتی ہے۔ اِدھر کچھ دنوں سے میں نے وہاں جانا ترک کر رکھا تھا۔ کچھ دنوں سے مرا دیہی کہ جب سے وہ تینوں شخص مجھے ملے تھے۔ اور اب تینوں کے غائب ہو جانے پر ایک عجیب اضطراب مجھ پر حاوی ہو اتھا کیا گھر اور کیا باہر — گھر میں میرا جی چاہتا باہر جاؤں اور باہر آکر سوچتا نہیں گھر زیادہ محفوظ تھا۔ پھر میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر پاتا کہ مجھے کہاں ہونا چاہیئے اور ایک بوجھل پن میرے جی پر آن پڑتا۔

اس شام میں یونہی، پرانے وقتوں کی طرح، چودھری صاحب کی دوکان پر جانکلا۔ کچھ پرانے کچھ نئے لوگ جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چودھری صاحب بولے:

"کیوں بھائی تمہارا کیا خیال ہے؟ کہتے ہیں یہ سب ایٹمی تجربات کا اثر ہے۔ سُنا ہے اب دنیا کے سرد حصّے گرم اور گرم سرد ہو جائیں گے۔ رُتوں کا سلسلہ

بھی بدل جائے گا"!

اس وقت میں نے پھر سوچا کہ ان تین دیہاتیوں کی واردات ان کو سناؤں، مگر اتنے ہجوم میں بات کرنے کو میرا جی نہ چاہا اور میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا تھا کہ اس شوم گھڑی کا نزول ہوا۔

اچانک ایک تیز، ناخوشگوار سی مہک کہیں سے آئی۔ ایسی مہک میں نے کبھی آج تک نہ سونگھی تھی۔ اس مہک کے آتے ہی میرا دل اندر ہی اندر ڈھینے لگا۔ اور معلوم نہیں جسم کے کس حصے میں بڑا گہرا مگر میٹھا میٹھا سا درد اٹھا۔ دراصل میں آخری وقت تک فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ مہک تھی یا درد۔ اس کی ناخوشگواری سے گھبرا کر میں نے اخبار میز پہ رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، کہاں چل دیئے؟" چودھری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیسی مہک ہے"۔ میں نے گہری گہری سانسیں لے کر کہا۔

"مہک ——— مہک کیسی؟" چودھری صاحب نے ہوا میں سونگھ کر کہا۔

اور میں ان سے بات کیے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ راستہ بھر اس عجیب و غریب ناخوشگوار درد اور دہشت بھری مہک کی لہریں آتی جاتی رہیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چکرا کر گر جاؤں گا اور چکرا کر گرنے سے پہلے کے نیلے نیلے اندھیرے میری آنکھوں میں گھومتے رہے جب میں گھر پہنچا تو ذکیہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا، چہرے پہ کیسی زردی ہے؟"

"ٹھیک ہوں"۔ میں نے کہا۔ "یہ مہک معلوم نہیں کیسی ہے"۔

میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھا حالانکہ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔

ذکیہ نے ہوا میں سونگھ کر کہا: یہ پڑوس میں جانے دن رات کیا معجون بنتے رہتے ہیں۔ حکیم صاحب کے یہاں اسی کی بو ہے اور پھر آج ہنڈیا بھی لگ گئی تھی

"مگر یہ تو ہر جگہ ہے —— ہر سڑک پر —— تمام شہر میں۔"

"موسم جو بدلا ہے۔ سردی کے پھول پتوں مہک ہو گی۔"

ذکیہ نے بے دھیانی سے کہا اور سلائی پر اُون کے خانے ڈالنے لگی۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ہوا میں سونگھا تو یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ مہک باقی ہے یا نہیں۔ شاید وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ختم ہونے مجھے بے حد خوشی ہوئی مگر پھر بھی اس کی یاد میرے اندر باقی تھی جیسے چوٹ کے بعد سوزش رہ جائے اور اس خیال سے مجھے کپکپی آ گئی کہ شاید وہ مہک لوٹ آئے۔ مگر دفتر کے کام کاج میں اس حادثے کو بھول گیا۔ آج میرے سامنے فائلوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد بڑے زور شور سے کسی فلم پر بحث کر رہے تھے اور کاغذات کا مفہوم میرے ذہن سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور چپراسی کو ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر عین اُسی وقت مجھے ایک شدید جھٹکا لگا جیسے میں کسی بے انتہا اونچان سے گر گیا ہوں۔ ایک تیز چکر کے ساتھ نیلے پیلے اندھیرے میرے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ دراصل وہ درد اور دہشت بھری مہک پھر لہر در لہر کہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے دیوانہ وار کھڑکیاں بند کرنا شروع کیا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے حیران ہو کر دیکھا۔

"بھئی، دھوپ آنے دو۔ بند کیوں کرتے ہو؟" حفیظ احمد نے اپنے مخصوص بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

یہ مہک —— تمہیں نہیں آ رہی کیا —— کس قدر ناقابلِ برداشت ہے۔"

مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے ہوا میں ناک اونچی کر کے سونگھا اور پھر حفیظ احمد نے قدرے تامل سے کہا:

"ہاں یار —— یہ کیسی بو ہے۔ یا شاید خوشبو۔ اس سے تو دل خراب ہونے ہونے لگتا ہے۔"

اس روز میں نے شہر میں کچھ اور لوگوں کو بھی اس مہک کا تذکرہ کرتے سُنا جس کی لہریں کی لہریں آتی تھیں اور پھر تھم جاتی تھیں، پھر آتی تھیں اور تھم جاتی تھیں۔ مگر شام کو غروب آفتاب کے وقت اِن میں تیزی اور شدت آتی جاتی۔ یہاں تک کہ چند ہفتوں میں اس مہک یا بُو کا یہ عالم ہو گیا کہ اکثر مجھے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اب اس شہر کے دمکتے چہرے ان لہروں پر یک دم زرد پڑ جاتے۔ اکثر لوگوں کو گرانی اور خفقان کا آزار رہنے لگا۔ اور ڈاکٹروں کا کاروبار خوب چمکا۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایٹمی تجربات سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اثرات ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مہک بھی انہی تجربات کا اثر ہے اور اسی باعث لوگوں کے اعصاب کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دکانوں سے اعصابی تھکن دور کرنے کی دوائیں ختم ہونا شروع ہوئیں۔ یہ بھی نہ تھا کہ دوائیں کم مقدار میں آتی ہوں۔ مگر اہل شہر میں اس دوا کی ذخیرہ اندوزی کا عجب جنون پھیلا تھا کہ چند ہی دن میں نیند کی گولیاں بھی گوہر نایاب ہو گئیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دونوں دواؤں کو بے سود پایا۔ درد و دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اپنی کاٹ میں تلوار سے زیادہ تیز تھیں اور آدمی کے اندر اترتی جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کروں کہ اس تلوار کی کاٹ کاٹتی مہک سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس سے مانوس ہو جائیے، اسے اپنا شامہ جانیے۔ دواؤں سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ مگر ایک عجیب بے دلی کے ہاتھوں میں خاموش رہا گو کچھ عرصے بعد ہی خود بخود یہی طریق کار سب نے اختیار کیا۔

اس مہک نے شہر میں دہشت کو عام کر دیا تھا۔ گو کوئی بھی بظاہر دہشت کو تسلیم نہ کرتا تھا مگر سب ہر لمحے کسی اَن جانے حادثے کے خوف سے سہمے رہتے تھے اور وہ سہم کچھ بے جا بھی نہ تھا کہ چند ہی ہفتوں بعد آخر وہ حادثہ رونما ہوا۔

وہ وسط دسمبر کی ایک شام تھی۔ میں چودھری صاحب کی دکان سے اُٹھ

کر گھر کی جانب آرہا تھا۔ ہر طرف سواریوں اور انسانوں کی ریل پیل تھی۔ دکانیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں اور اہل شہر بظاہر زندگی کے جھمیلوں میں مصروف تھے۔ اس دہشت درد بھری مہک کی لہریں کبھی کبھی کاٹ کر گزر جاتیں۔ میرا سر چکرا جاتا۔ میں رک جاتا اور پھر لہر کے گزرنے کے بعد چلنے لگتا۔ اب تمام اہل شہر کا یہی دستور ہو گیا تھا گو وہ خود اس کا علم نہ رکھتے تھے۔ کوئی باہر سے آنے والا انہیں دیکھتا تو حیران ہوتا کہ آخر یہ چلتے چلتے، کام کرتے کرتے ان آدمیوں کو کیا ہوتا ہے کہ اچانک رک جاتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں سانس روک لیتے ہیں۔ اور پھر ایک گہری سانس لے کر مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہاں اب یہی ہم سب کا معمول تھا۔ وسط دسمبر کی اس شام میں پل کے قریب تھا کہ اچانک میرے سر پر ایک برچھی لگی۔ چکرا کر میں نے بجلی کے کھمبے کا سہارا لیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔ مگر برچھی تو کہیں نہ تھی، اور نہ ہی برچھی مارنے والا کوئی ہاتھ۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہ برچھی نہیں اسی مہک کی نہایت شدید ——— ناقابل بیان حد تک شدید ——— لہر تھی۔ خوف نے مجھے منجمد کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس بو یا مہک (معلوم نہیں وہ کیا تھی) کا سرچشمہ کہیں میرے قریب، بہت قریب پہنچ گیا ہو۔ میرے شانوں کی ہڈیوں کے درمیان۔ گردن کے قریب۔ میرے عین پیچھے کہیں مجھ سے اتنا قریب کہ مجھ سے الگ بھی نہ ہو۔

مگر اچانک میری نظر سامنے آنے والی ایک عجیب و غریب سواری پر جا رکی وہ ایک بہت بڑا گڈا تھا جسے دو سفید بیل کھینچ رہے تھے۔ بیلوں کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے تھے اور ناکوں میں موٹے موٹے رستے۔ اور سفید جلد تلے ان کی پسلیاں اور کولھوں کی ہڈیاں سانس لیتی تھیں اور رستوں جڑے نتھنوں سے سانس کی گرم بھاپ اٹھتی تھی گڈے کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلا سا بنا تھا اور اس کے اندر سیاہ پردے تنے تھے۔ دراصل وہ پردے بھی نہ تھے۔ جیسے ہلتی لہریں کھاتی اندھیرے کی دیواریں۔ سامنے سے تھوڑی سی خالی تھی اور سیاہ پردے سے باہر دو گاڑی بان بیٹھے۔ ہڈیوں بھرے اندھے بیلوں کو ہانکتے

تھے۔ ان گاڑی بانوں کی شکلیں اندھیرے کی وجہ سے میں نہ دیکھ سکا۔ اور پھر سیاہ کپڑوں پر انہوں نے مٹگیلی چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں کہ ان کے آدھے آدھے چہرے چھُپ گئے تھے۔ ان کے سر جھکے تھے۔ جیسے لمبی مسافت کے بعد نیند کا غلبہ ہو۔ ان کی پشت پر وہ سیاہ پردہ (یا دیوار) ہولے ہولے ہلتا تھا۔ اور سیاہ پردہ (یا دیوار) کے اندر اندھیرا اُبھرا تھا اور اس گھُپ اندھیرے کے گرد سیاہ پردے تنے تھے اور ان پردوں میں سے درد دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اُٹھتی تھیں جن کی کاٹ تلوار سے بڑھ کر تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی میرے قریب سے گزر گئی اور میں چکرا کر کچے میں اتر کر قے کرنے لگا۔

مجھے معلوم نہیں اہلِ شہر نے اس شام اس گاڑی کو دیکھا یا نہیں، اور جو دیکھا تو ان پر کیا گزری۔ میں بمشکل گھر پہنچا اور چارپائی پر گر گیا، ذکیہ نے مجھ سے بہت پوچھا مگر ایک کُند دہشت نے میری زبان بند کر رکھی تھی۔

چند روز بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ شہر کی میونسپلٹی انتہائی غیر ذمہ دار ہوتی جا رہی ہے۔ کوڑے کرکٹ بھری گاڑیوں کو ہر شام شہر کی اہم سڑکوں سے نہیں گزرنا چاہیئے۔ اس سے فضا متعفن ہوتی ہے اور اہلِ شہر کبیدہ خاطر۔

میں نے دفتر سے ہفتے بھر کی چھٹی لی تھی اور ان سات دنوں میں شہر کی کیفیت خود نہ دیکھ سکا۔ مگر اخبار سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب گاڑی سیاہ پردوں میں، غالباً "کوڑا کرکٹ بھرے"، شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہے، جس کے گاڑی بان خوابیدہ ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی مضافات سے ہوتی شہر سے گزرتی ہے اور پھر میونسپلٹی سے مطالبہ کہ اس قسم کی ناخوشگوار گاڑیوں کا شہر میں داخلہ بند کیا جائے یا ان کے لئے کم آباد رستہ مقرر کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

ساتویں روز میں گھر سے نکلا۔ ان سات دنوں میں اہلِ شہر کس قدر بدل چکے تھے۔ چاروں سمت زرد زرد دبے خواب چہرے چل پھر رہے تھے، جو بے فکر

اور لاپروا نظر آنے کی کوشش میں بڑے درد بھرے انداز میں مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ (اور مجھے یاد آیا کہ آج صبح آئینے میں میرا چہرہ بھی ایسا ہی تھا) شہر میں اچانک تفریحی تقریبات بکثرت ہونے لگی تھیں اور اہل شہر جوق در جوق، ان تقریبات میں جاتے تھے، بلکہ وقت سے بہت پہلے دروازوں پر منتظر رہتے تھے۔ اور واپسی پر ان کے چہرے پہلے سے زیادہ زرد اور مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔

دفتر میں میں نے فائلوں کی طرف توجہ کرنے کی کوشش کی مگر بار بار میری آنکھوں کے سامنے وہ گاڑی آجاتی تھی۔ میونسپلٹی کے گڈے اس صورت کے تو کبھی نہ تھے۔ اس کے نیم خوابیدہ گاڑی بان، آنکھوں پر بندھے پٹیوں بھرے بیل اور سیاہ پردوں کے اندر بھرا اندھیرا اور اس کی دہشت بھری مہک جس نے اہلِ شہر کو متلی میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے چہروں کا رنگ نچوڑ لیا تھا اور ان کی آنکھوں کی چمک دھو ڈالی تھی۔ وہ پردوں ڈھکا اندھیرا بار بار میرے سامنے آئے جاتا تھا۔ کس چیز کی باس ایسی ہو سکتی تھی؟ تعفّن اور خوشبو کا مرکّب؟

اچانک ایک پاگل خواہش سے میرا گلا رُک گیا۔ میں نے تصوّر میں دیکھا کہ میں اندھا دھند اس گاڑی کی جانب بھاگا جاتا ہوں اور ہاتھ سے اس کا پردہ ہٹاتا ہوں۔ اندر دیکھتا ہوں ـــــ اندر کیا ہے ـــــ؟ اس تعفّن اور خوشبو کی اصل دیکھنے کی خواہش نے پاگل پن کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ اس لئے آج پھر غیر ارادی طور پر میرے پاؤں راوی کے پُل پر دھیمے پڑ گئے۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ دیر تھی اور درد دہشت بھری مہک کی لہریں ہولے ہولے تیز ہو رہی تھیں۔ جنگلے ساتھ لگ کر ایک عجیب خوف نے مجھے گھیرا۔ دریا کی دلدل باہیں پسارے مجھے بلا رہی تھی۔ تہہ دار ـــــ نگل جانے والی دلدل ـــــ اور مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا میں اس میں کود جاؤں اور اس میں اترتے سورج کے ساتھ جذب ہو جاؤں اور ہمیشہ کے لئے اس چادرِ خون میں دفن کر دیا جاؤں۔ مجھے یوں لگا کچھ میرے قریب آ رہا ہے یا میں خود کسی چیز کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ وہ جس کا مجھے ـــــ

نہیں ہم سب کو —— ہم سے پہلوں اور ہم سے بعد آنے والوں کو انتظار ہے اور میرا جسم پتھرا رہا ہے۔ مگر اس پل اور دلدل اور سورج سے نجات نہیں۔ وہ میرے اندر ہیں اور میرے ساتھ۔ میں نے بے بس ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اچانک میرا دِل رُک گیا۔

تین شبیہیں ایک سی چال میں چادروں کی بکل مارے چلی آتی تھیں۔ میں پتھرائی آنکھوں سے مضافات کی سمت انہیں دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ قریب آن رُکے۔ آج معمّر شخص کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی سفید ڈاڑھی اُن سے تر تھی۔ باقی دونوں کی آنکھیں جھکی تھیں۔ اور دانت بھنچے تھے اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔

"تم اتنے روز کہاں غائب رہے —— میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے بتاؤ یہ شہر میں کیا ہو رہا ہے"۔ میں نے لڑکھڑاتی زبان میں ٹوٹتے سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہم انتظار کر رہے تھے۔ ہم اپنے آپ کو روک رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو باندھ رکھا تھا۔ یہ دیکھو"۔

معمّر شخص اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی باہیں میرے سامنے پھیلائیں اور اپنے شانے اور پشتیں جن پر رسّوں کے نشان کندہ تھے۔

"ہم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے"۔ معمّر شخص کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

"مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ——" دوسرے کی بات ادھوری رہ گئی۔ یکدم وہ پیٹ پکڑ کے دوہرا ہو گیا اور اس کے ساتھی بھی شدید کرب میں جھک گئے۔ اس دکھ دہشت بھری مہک کی شدید لہریں گزر رہی تھیں، ہمیں کاٹتی ہوئی ہمارے اندر جذب ہوتی ہمیں چوستی ہوئی۔

"وہ دیکھو!" معمّر شخص نے اچانک دیہات کی طرف اشارہ کیا اور پھر تینوں کے چہرے موت کی زردی میں ست گئے۔ میں نے دیکھا گرد اڑتی راہ پر سیاہ

گاڑی کا ہیولا اُبھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں مولے رَتے اور سیاہ کپڑوں، ملگجی چادروں کی بکلوں میں چہرہ چھپائے نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کاٹتی چوستی دُکھ دہشت بھری مہک ہمہ وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں اور ان کے پیچھے سیاہ پردے —— ایک لرزش مجھے سر سے پاؤں تک روند گئی۔ تینوں دیہاتیوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی جیسے وہ موت کے قریب ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی اور اس کی کاٹتی مہک ہمارا لہو چوس رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی، یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بانوں کے چہرے چادروں میں چھپے تھے اور سیاہ پردے (یا دیواریں) مدہم ہوا میں ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔

اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انہوں نے پردہ اُٹھا دیا۔ ان کے سر پردے میں چھپ گئے مگر پردہ اُٹھنے کے باوجود نہ اُٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت ناک غیر انسانی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پلٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔

"تم نے کیا دیکھا؟ تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔

"بولو —— بولو ——" میں نے ان کی منت کی۔ مگر وہ بھاگتے رہے۔

یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔

"مجھے بتاؤ مجھے بتاؤ" بالآخر میں نے معمر شخص کی چادر پکڑ لی۔

اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا مُنہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔

وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔

میں چکرا کر گر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اُڑتی رہی، پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا۔

مہینوں میں نے ان تینوں کو ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام ونشان نہیں۔ اسی دن سے گاڑی نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی، پُل سے ہو کر کچے میں اتر جاتی ہے۔ اور مضافات کا رُخ کرتی ہے۔ اہلِ شہر اس دکھ دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کاٹتی لہریں مر گئیں۔ بھولی بسری کہانی کی طرح ـــــ مگر میں اب بھی انہیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر بولتا ہے: "اب تمہاری باری ہے ـــــ اب تم دیکھو گے"۔

اور آج میں اس پُل پر آن کھڑا ہوا ہوں، اس سواری کے انتظار میں۔

نام کی کہانی

اب وہ کسی سے کیا کہتی؟ اول تو یہ نام بھول جانے کا قصہ ہی عجیب تھا۔ کہ حرف سب کے سب موجود تھے۔ اور مل کر ایک نام اب بھی بناتے تھے۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پہلے یہ لفظ وہ خود تھی۔ مگر اب وہ محض خول تھا۔ وہ اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اصل نام وہ خول تھا۔ یا وہ خود، جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اسی لئے سب کام تھم گئے تھے۔ یا شاید یہ حادثہ اس لئے ہوا تھا۔ کہ ایک مدت تک وہ اپنے نام کا شدید احساس کرتی چلی آئی تھی۔ مثلاً جب جمیل نے اسے چھوڑا تو اسے ہر دم اپنے نام کا احساس رہتا وہ لوگوں سے الگ موجود تھی، ایک اٹل لفظ۔ کیونکہ لوگوں نے اسے اپنے سے علیحدہ کیا تھا۔ چنانچہ سوتے جاگتے، اندھیرے اجالے، کوئی یہ لفظ اس کے کان میں پھونکتا رہتا۔

اس لفظ کی کیفیت عجب تھی کہ اسے ہر دم ہوشیار رہنا پڑتا۔ وہ پل بھر غافل ہوئی اور نام نے اپنے لمبے سے پنجوں میں اسے پکڑا۔ اس سے بچنے کی خاطر اس نے سو سو جتن کئے۔ پہلے پہل نزہت کا جہیز تیار کیا۔ اور راتوں جاگ جاگ کر کپڑوں پر قطعی غیر ضروری کڑھائی کی۔ گوٹا لچکا لگایا۔ پھر سب گھر کے کپڑوں کی سلائی کا ذمہ لیا، دھلائی، استری، کڑھائی مگر جونہی وہ پل بھر کو سانس لینے رکتی کوئی۔ وہ لفظ اس کے کان میں پھونکتا۔ پھر ایک ایک چیز کا دہن پیدا ہوتا۔ چاروں سمت بس ایک ہی لفظ رہ جاتا۔ (وہ خود اپنی آنکھوں سے چیک کے رہ جاتی) اور اس لفظ کی عجیب دہشت تھی۔ کہ ہنستے ہی اس کا جی ڈھینے لگتا۔ جیسے خواب میں کوئی۔ بلا پیچھے بھاگے اور بھاگا نہ جائے۔ پاؤں کسی طلسم سے بوجھل ہو جائیں اور فاصلہ کٹنے پر

نہ کٹ پائے۔

مگر جب وہ نزہت کے پاس آن رہی تو عجیب اتفاقات ہونے شروع ہوئے اب یہ بھی ہوا کہ گھنٹوں اسے اس لفظ کی یاد نہ آئی۔ کچھ اس لئے بھی کہ نزہت کے بلو، گٹو اور منو کا بے ڈھنگا کام اسے الجھائے رکھتا۔ انہیں اسکول کے لئے تیار کرنا، ناشتہ کروانا، کپڑوں کا حساب، کمروں کی صفائی۔ نزہت کے کپڑوں کی سلائی نسیم کے کرتے۔ کبھی کبھی تو ایک پل کی فرصت نہ ملتی۔ صبح آنکھ کھلتی اور ایک جھپکنے میں رات آن پہنچی۔ کبھی نیند اور بیداری کے درمیانی فاصلے میں وہ لفظ ہوا کے جھونکے کی طرح چھو کر گزر جاتا۔ مگر پھر بلو کے کپڑوں، گٹو کے سویٹروں اور منو کی گڑیوں کا سلسلہ پھیلنے لگتا۔ اور پل بھر میں صبح ہو جاتی۔

اب کاموں کا سلسلہ اسے ایک طلسمی دنیا نظر آتا۔ دنیا میں کتنے بے شمار کام پھیلے ہیں۔ کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں ان کاموں کی فہرست بنانے لگتی۔ پھر اسے اس بات پر حیرانی ہوتی کہ آخر اتنے ڈھیروں کام پیدا کس طرح ہوئے۔ تب اس کا ذہن نئے نئے کاموں کی تخلیق میں الجھنے لگتا۔ ٹاٹ پر اون کی کڑھائی۔ دھجیاں جوڑ جوڑ کر پردے اور پلنگ پوش بنانا۔ گھر کی آرائش کی نت نئی چیزیں۔ ان کاموں کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وقت گزرتا رہتا۔ دن کے طلوع اور غروب کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہتا۔ کام فاصلوں اور وقت کو چوسنے کا آلہ تھا جس طرح سیاہی چوس سیاہی چوسنے کا۔

کام کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی تھی۔ بھوک — اندر ہی اندر پھیلنے والا ایک اندھا شگاف، جس میں آگ دہکتی تھی۔ اور اس آگ کے دہکتے رہنے میں عجب طمانیت تھی۔ ایسے میں وہ فخر کے ساتھ پچکے پیٹ کو محسوس کرتی اس کی انگلیاں ابھری پسلیوں کو گنتیں، پھر جسم کی ایک ایک ہڈی اسے نظر آتی۔ جیسے وہ خود اپنا ایکس رے ہو۔ اس پر اسے میٹھا میٹھا اطمینان ملتا۔

"آپو — خدا کے لئے کچھ کھالو۔ بٹاؤ یہ کام" نزہت بار بار کہتی۔

"بس ابھی آئی —" مگر وہ گھنٹوں بھوک اور مٹتے جسم اور ابھرتی ہڈیوں کے سرور میں بیٹھی رہتی۔

"تمہیں تو کام کا ہوکا ہے آپو—" نزہت اس وقت کہتی جب وہ اس کے کہنے پر کسی سے ملنے ملانے چلی جاتی۔ مگر تمام وقت اسے یوں لگتا رہتا۔ جیسے دنیا سے کام مٹتے چلے جاتے ہوں اور کاموں کا مٹنا سب سے بڑا عذاب تھا۔

مگر اچانک یوں ہونے لگا کہ سورج ڈوبنے کا عمل دیکھتے دیکھتے ہی طویل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ گھنٹوں پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر رینگتی انگل انگل سرکتی ہے۔ سورج گھنٹوں اندر باہر رہتا ہے۔ اور وقت کا رشتہ دن کے ساتھ جڑتا ہے نہ رات کے ساتھ۔ پہلے دن جو پورے کا پورا کٹ جایا کرتا تھا۔ اب نہ کٹتا۔ گذرنے پر بھی کہیں آس پاس منڈیروں پر منڈلاتا رہتا اور اس پر اسے مدتوں پہلے کا پانی بھرا تسلا یاد آتا۔ جب کبھی سورج گرہن لگتا۔ تو چھت پر پانی بھرا تسلا رکھا جاتا پہلے پانی دیر تک جھلملاتا رہتا۔ پھر رکتا اور سنولائے سورج کی پرچھائیں اس میں تیرتی پرچھائیوں کے دیکھنے پر اسے ہمیشہ یوں لگتا۔ جیسے نیند میں چل پھر رہی ہے۔ اور نیند میں چیزیں لمبی، گھٹتی ہوئی، چپٹی، کھینچتی چلی جاتیں۔ اب تو دن کا بھی یہی عالم ہوا تھا۔ آسمان سے طلوع ہوتا نہ غروب۔ جیسے پانی بھرے تسلے میں ڈولتا پھرتا۔ نیند سے بھرا۔ لمبا، چپٹا۔ کھینچتا ہوا۔ چنانچہ پہلے کی طرح اب دن گذرنے پر اسے کسی لکیر کے کٹ جانے کا احساس نہ ہوتا۔ اسی لئے کام لمبے ہوتے چلے جاتے۔ جیسے کوئی مٹیالا اسٹک کھینچتا چلا جائے۔ یوں بھی وہ اکثر کام کر چکنے کے بعد وہم میں پڑ جاتی کہ واقعی وہ کام ہوا یا نہیں۔ دنوں کی طرح پہلے کام بھی پورے کے پورے نبٹ جاتے تھے۔ صبح سویرے۔ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرنا۔ پھر کپڑوں کی دھلائی استری، دوپہروں میں سلائی اور کڑھائی —— اسی طرح مارا مار کام اور دن گذرتے چلے جاتے اور رات کو سوئی سوئی تھکن میں سب کچھ ڈوب جاتا۔

تب کی نیند بھی اب کی نیند سے بہت مختلف تھی۔ اپنے وقت پر شروع اور ختم ہو جاتی مگر اب اس کا کوئی شروع تھا۔ نہ آخیر۔ جب وہ سمجھتی کہ جاگ رہی ہے۔ اور کام کرتی ہے۔ تب اچانک اسے لگتا کہ ہاتھ ہلنے کے باوجود نہیں ہلتے اور ٹب کے صابن گھلے پانی میں ذرا سا بھی گیلا پن نہیں۔ کپڑوں کا کوئی لمس نہیں پھر بھی وہ کپڑے دھو رہی ہے۔ اس پر اسے حیرت ہوتی اور پھر اس پر کھلتا کہ دراصل وہ چوکی پر بیٹھے بیٹھے سوتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر پمپ چلاتی۔ ٹب بھر

جاتا اور دھلائی شروع ہو جاتی۔ کپڑے دھلتے چلے جاتے اور الگنی بھرتی چلی جاتی۔ پھر کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ چوکی پر بیٹھی بیٹھی سو رہی ہے۔ نیند اور بیداری کی حدیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔

کبھی کبھی اسے خیال سا آتا کہ اس سے پہلے چیزیں صاف صاف اور جیتی جاگتی تھیں اور یاد کے بے شمار سلسلے ان کے گرداگرد پھیلے تھے۔ مگر اب کبھی ایک آدھ ٹکڑا تصویر کا اور بے ربط شبیہیں ادھر ادھر سے آن جڑتیں۔ برسوں پہلے کی کوئی آواز سنہری چٹیلا۔ سلیٹی فرش پر بکھری کرچیں، پیتل کی جگر جگر کرتی بالٹی۔ خوشبوؤں کا بھی یہی عالم تھا۔ کہ کبھی گھپ اندھیری نیند سے وہ اندر ہی اندر پھیلتے کسی تنگنائے سے چونکتی اور چونکنے اور پوری طرح بیدار ہونے کے درمیانی فاصلے میں بے موسمے پھولوں کی خوشبوئیں آتیں۔ جو بیدار ہونے پر بالکل وہم لگتیں۔ پہلے چیزوں اور خوشبوؤں کا یہ طور تھا کہ واقعات کے سلسلوں میں گندھی گندھائی چلی آتی تھیں مگر اب ان سلسلوں کے بغیر ٹکڑے ٹکڑے مٹیالے پن میں تیرتی پھرتی تھیں۔

باتوں، خوشبوؤں، چیزوں اور آوازوں کا یوں ٹکڑے ٹکڑے مٹیالے پن میں تیرتے پھرنا کچھ ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایک مدت سے اسے کسی بات پر تشویش بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ایک شام وہ منو کے بال سنوارتی تھی۔ اور بلو گڈو قریشی صاحب کے بچوں کے ساتھ باہر لان میں کھیلتے تھے۔ نزہت اور نسیم کچی لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اور اندر سب کے سب کمرے، سجے سجائے خالی پڑے تھے۔ منو کے بالوں سے صابن کی گیلی گرم مہک آتی تھی۔ اور اس کے ہاتھ الجھے بالوں کو تیزی سے سلجھا رہے تھے۔ اور بالوں اور کنگھی کا ــــ اور اس کی کرسی کا عکس پر وہ بیٹھی تھی۔ کوئی لمس نہ تھا۔ تب اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر رک گئی۔ خشک بے رنگ جلد پر ابھری ابھری نیلی نسیں۔ مردہ شاخوں کی طرح نکلی انگلیاں جن میں سیاہ رنگ کی وہ دندانے دار چیز تھمی تھی۔ اور ان دندانوں میں بال الجھے تھے۔ پھر اس کی نظر ہوئے ہوئے تیرتی سوکھی کلائی پر جا رکی اور اسے اس بات پر حیرت ہوئی۔ کہ وہ اس ہاتھ اور کلائی کے ساتھ برسوں سے رہ رہی ہے۔ اور اس ہاتھ اور کلائی نے اسے اپنے جسم کے باقی حصوں کی یاد بھی دلائی۔ جو شروع سے اس کے رفیق تھے۔ تب اسے یوں لگا کہ

وہ نیند نہیں ہے اور گھپ اندھیرے میں سب سمتیں کھو گئی ہیں۔ اور معلوم نہیں وہ کس رخ، کس سمت موجود ہے۔ دن کے اجالے میں جانی پہچانی چیزیں اندھیرے میں گھل گئی ہیں۔ برسوں پہلے اس طرح ہوا کرتا تھا، کہ گھنی رات میں اچانک اس کا جی دہلتا اور اسے اپنی جگہ اور سمت کا اندازہ نہ ہو پاتا۔ مگر اب دن کے اجالے میں اسے اپنے آپ کو اس جگہ اور حالت میں پا کر حیرت ہوئی۔ جیسے وہ نیند میں چلتے چلتے یہاں آن پہنچی ہو۔ اس نے بہت یاد کرنا چاہا کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ وہ کہاں سے چلی — کدھر سے آئی۔ مگر اس کے پیچھے — آگے، چاروں طرف ٹیالی دھند تھی۔

تب اسے یقین ہوا کہ اس سے پہلے وہ تھی ہی نہیں۔ بس شروع سے آج تک اسی طرح تھی۔ ہاتھ میں کنگھی تھامے منو کے بال سلجھاتی۔ مگر منو تو بہت چھوٹی سی ہے۔ یہی کوئی پانچ برس کی۔ اور اس نے اپنی ڈھلکتی کلائیوں پر دوبارہ نظر کی۔ اسے وقت کے بے تحاشا گزرنے کا خیال آیا۔ مگر ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ سورج گھنٹوں سے غروب ہو رہا ہے۔ اور پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر نیند بھری رفتار سے انگل انگل سرکتی ہے۔ اور سرک نہیں چکتی۔ صبح سے معلوم نہیں کب سے — سورج اندر باہر ہے۔ دن ہی ہے۔ نہ رات — اور سب کام ادھورے، کھنچتے چلے جاتے ہیں۔

”ہائی آپو بس بس“۔ بے خبری میں منو کے بال کھینچ گئے تھے۔

”اچھا اچھا —“، اس نے کنگھی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ منو اچھلتی ہوئی باہر چلی گئی

”راجہ کی چابی چوری گئی۔ چوری گئی —“، بچے لان میں کھیل رہے تھے۔

”آپو باہر آجاؤ —“، نزہت نے اسے پکارا۔

مگر اسے تو بہت کام کرنا تھا۔ وہ نزہت کی ادھوری قمیض میں ترپائی کرنے لگی۔ پر دو ہی ٹانکوں بعد اسے نیند محسوس ہوئی۔ اور اسے خیال آیا کہ آج وہ دن بھر نہیں سوئی۔ تب قمیض کو گود میں رکھے رکھے وہ دیوار کے ساتھ لگ کر سو گئی اور اس طرح سوتے ہوئے اسے مدتوں پرانی وہ نیند یاد آئی کہ جب ایک گہرا لپیٹا ہوا۔ نہ ہونے کا احساس سے آتا تھا۔

پھر وہ دھوپ میں جلتی چھت پر کھڑی تھی۔ اور نشے کے میلے پانی میں سورج کی سنولائی

پرچھائیں تیرتی تھیں۔ نزہت بگلوں کی طرح تسلے پر جھک جھک کر گرے جاتی تھی۔ اور کسی کے گندمی دو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں جان سے بھری، اس کے کانوں پر جھولتی تھیں۔ وہ خود بھی تسلے پر جھکی اور اب کے بلتے پانی میں اس کی اپنی پرچھائیں تیری۔ پھر تسلا پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ چھت کے برابر ہو گیا۔ پھیلتے پھیلتے تانبے نے اسے دیواروں کے ساتھ بھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار کے اندر داخل ہو گئی۔ ان مٹیالی اینٹوں میں کی ایک اینٹ، جس کی کوئی پہنچان نہ تھی۔ اس نے جاننا چاہا کہ وہ نیند میں ہے۔ اور اس لئے وہ جاگ گئی۔ مگر جاگ اٹھنے پر اس نے دیکھا کہ وہ برابر قمیض میں ترپائی کرتی ہے۔ اور اب بس ذرا سا کونہ باقی ہے۔

یہ جاگتی نیند بھی عجیب تھی۔ شروع شروع میں اس نے پرانی پرانی باتیں یاد رکھنے کی کوشش کی، مثلاً یہی کہ اس نے آج تک کون کون سے کپڑے پہنے، پرانی پرانی قمیضیں ——— جوتے ——— اس کے سامنے مٹیالے پن میں تیرتے چلے آتے۔ پھر خوشبوئیں اور زیور ——— سبھی کچھ موجود تھا۔ مگر واقعات کہیں نہ تھے۔ کیونکہ واقعات کھو چکے تھے۔ اس لئے وہ خود بھی موجود نہ تھی۔ ——— بغیر واقعات کے کوئی کس طرح ہو سکتا ہے۔؟

کبھی نزہت نسیم کو بھلی باتیں سناتی۔

"اماں ابا جان پر آپ کا بڑا رعب تھا۔ ہماری تو بس پٹائی ہوتی تھی۔"

اور اسے گذرے انسانوں پر حیرت ہونے لگتی۔ اماں ابا کی تصویر نزہت کے کمرے میں لگی تھی۔ مگر وہ شبیہیں بھی محض خول تھیں۔ ان کے اندر بھرے انسانوں کے معنی کب کے ختم ہو چکے تھے۔ پہلے کبھی کبھی وہ ان تصویروں کے پاس حیرانی سے رک جاتی کہ ان فریموں میں سے تصویریں کہاں گئیں؟ پھر وہ دیکھتی کہ تصویریں تو موجود ہیں۔ مگر اب تو مدتوں سے اسے ان بھرے فریموں کا خالی پن بھی نظر نہیں آیا تھا۔ سو اس نے چیز یاد کرنے کی محنت ترک اور نام سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کی۔

پہلے جب دن کا شروع اور اخیر تھا، وقت کی لمبان کو کام کاٹتے تھے۔ اب دن مٹیالے الاسٹک کی طرح کھنچتا تھا اور کام رکے رہتے تھے۔ اور اس طرح دنوں کے کھینچنے اور کام ول

کے رکنے پر اسے شدید بھوک لگتی۔

"شکر ہے آپو تمہیں بھی بھوک لگی" نزہت بہت خوش تھی۔

اب بھوک وقت کی لمبان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتی۔ مگر نیند کی طرح بھوک کا بھی عجب عالم تھا۔ کہ اس کا کوئی شروع تھا نہ اخیر ــــ کھا کر بھی اسے لگتا نہیں کھایا ــــ چنانچہ اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے اسے بار بار کھانا پڑتا۔ آہستہ آہستہ اس کے پچکے پیٹ اور کمر کے تنگ حلقے پر گوشت کی نرمی جمنے لگی۔ اور ہڈیاں چھپنے لگیں۔ اس کا وہ پرانا ڈھانچہ مٹ رہا تھا اسی لئے اپنے کو چھو کر اسے کسی اور کو چھونے کا احساس ہوتا ــــ

شروع میں ہر چیز کا اپنا ایک ذائقہ تھا۔ نمکین ــــ میٹھا، ترش، کڑوا۔ مگر جوں جوں بھوک بڑھتی ذائقے ختم ہونے لگے۔ اب محض ایک ذائقہ باقی تھا۔ بالکل اس جاگتی نیند کا سا۔ جو شاید ذائقہ بھی نہیں تھا ــــ دراصل وہ محض زبان تھی ــــ سر سے پاؤں تک ــــ ذائقے سے عاری ــــ

نزہت اب اسے کھاتا دیکھتی اور پریشان ہوتی "آپو، طبیعت تو ٹھیک ہے۔ نا تمہاری؟" اور روٹیوں کی پلیٹ اس کے سامنے سے کھینچتے کھینچتے رک جاتی۔

"ہاں ــ کیوں؟" وہ بے دھیانی سے پوچھتی۔

"نہیں کچھ نہیں ــ" نزہت کچھ کہتے کہتے رک جاتی اور وہ اپنے خول کو بے ذائقہ مواد سے بھرنے لگتی۔ جو بھر کر بھی خالی رہتا۔

پہلے اس نے دیکھا کہ اس کی تمام ہڈیاں گوشت کی دبیز تہوں میں جا چھپیں اور اب اس کی پہچان مٹی ــــ وہ بدل چکی تھی۔ کچھ اور بن چکی تھی۔ پھر اسے گوشت کا بوجھ اپنے جسم سے الگ محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ منوں گوشت کا لوتھڑا ہو۔

"آپو تم بیمار ہو ــــ چلو ڈاکٹر کے پاس ــــ جسم کا بے تحاشا بڑھنا ٹھیک نہیں۔" نزہت بہت فکر مند تھی۔

اس پر اسے حیرت ہوئی۔ جسم بڑھنے سے کیا مطلب؟ یہ تو سب کا سب خود جسم ہے۔ ہمیشہ سے اسی طرح اس نے پہلے اپنے جسم پر نگاہ کی اور پھر اپنے گرد دیکھا۔ معلوم نہیں وہ

دن کا کون پہر تھا۔ ہر چیز سانس تھامے کھڑی تھی اور چاروں طرف مٹیالی روشنی پھیلی تھی۔ ایک گھنا امس غول کی طرح تنا تھا۔ سڑک کی جانب سے کہیں سویا سویا سا شور جاگا۔ بہت سی آوازیں اور لفظ ایک دوسرے میں گھل کر ایک لمبی ہوک بن گئے تھے ــــــ

"ر کالیاں اٹاں کالے روڑ ــــــ" اس ہوک کی مدہم سی پہچان اٹھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھا ــــ بچوں کی بے ڈھنگی ٹولیاں، کٹورے بجاتیں، مٹیالے امس میں لپٹے آسمان کی طرف منہ اٹھائے۔ پکار رہی تھیں۔

"مینہ وسا دے زورو زور ــــــ" دور بچوں کی ہلتی مچلتی ٹولی میں ایک شبیہہ چھوٹی سی لڑکی کی تیری۔ اس نے پہچاننا چاہا ــــ اور کھڑکی سے قریب ہوتے ہوئے اچانک آئینہ کے سامنے آن رکی۔ بے ڈھنگے کپڑوں میں لپٹا منوں گوشت ــــ ڈھلکتے چہرے پر کھچڑی بال پھر اس کی نظریں اس شبیہہ کی آنکھوں میں آن رکیں۔ ایک لفظ کے دائرے اور نقطے ان میں کلبلاتے تیرتے پھرتے تھے۔ تب اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ مگر اس کے پاؤں کسی سیاہ طلسم سے بوجھل ہوئے۔ وہ ایک قدم کا فاصلہ تھا کہ پھیلتا کھینچتا ــــ آسمان سے جا ملا تھا۔

⁂

"ھزار پایہ"

میں نے دروازہ کھولا۔ اندر کے ٹھنڈے اندھیرے کے بعد، باہر کی چکا چوند اور تپش پر میں حیران رہ گیا۔ دروازہ جس کا رنگ بیلٹی اور جالی مٹیالی تھی، اسپرنگوں کی ہلکی سی آواز سے بند ہو گیا۔ اس بند دروازے کے اندر ٹنکچر آیوڈین اور اسپرٹ کی بو تھی، اور چمڑے منڈھے لمبے بنچوں اور پالش اتری کرسیوں پر لوگ، بیٹھے اخبار اور رسالوں کے ورق بے دلی سے اُلٹتے تھے۔ پرد۔ نوائے وقت۔ پاکستان ٹائمز۔ اور کمرے سے باہر چبوترے پر میں کھڑا تھا۔ میں ابھی چند لمحے پہلے اندر تھا۔ اور اب باہر۔ اس چبوترے سے آگے، جہاں میں اس وقت کھڑا تھا۔ ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے گرداگرد کھٹے کی گھنی باڑ۔ یہاں سے سامنے کی طرف ایک آدھ کیاری نظر آ رہی تھی۔ جس میں بے حد سرخ، لہو ایسے گلاب کھلے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے کٹوروں کی مانند کچھ زرد پھول۔ جن کا نام میں نہیں جانتا۔ اور اس لان کے ساتھ ساتھ کچا راستہ جو لکڑی کے سفید پھاٹک پر ختم ہو جاتا تھا، میں چبوترے کی پانچ سیڑھیاں اُتر کر کھٹے کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا گیٹ تک آیا۔ اسے کھولا۔ اس کی چولیں بھی ہولے سے چر چرائیں۔ پھر اس گیٹ کے باہر ایک گنجان سڑک پھیلی تھی۔

باہر نکلتے ہی میں نے پل بھر کو آنکھیں بند کیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ میں نے کیا دیکھا۔ سرخ اندھیرا ہونے سے سبز اندھیرا بنا۔ پھر زرد ذرد روشنی کے دھبے کبھی سیاہی مائل نیلے۔ کبھی سفید ہونے لگے۔ کچھ چیزوں کے خطوط جلتے بجھتے رہے۔

ان جلتے بجھتے اندھیروں کے ساتھ پھر میرے گلے میں وہ پھندا آن پڑا۔ اور ہولے ہولے میرے جبڑے سست پڑنے لگے۔ منہ خود ہی کھل گیا۔ میں نے دانتوں کو باہم بھینچنے کی کوشش کی اور میری مٹھیاں اس کوشش میں دکھنے لگیں۔ مگر اوپر تلے کے دانت ایک دوسرے سے جدا ہی رہے۔ آخر میں نے جیب سے وہ شیشی نکالی اور ایک گولی منہ میں رکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے اندر ایک ہزار پایہ پل رہا ہے۔ لمبے لمبے پنجوں والا کیڑا جو رفتہ رفتہ اپنی بے شمار شاخیں پھیلا رہا ہے۔ میری رگوں میں گاڑھا ہے۔ مگر معلوم ہونے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ ابھی اس کمرے کے اندر ڈاکٹر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ مگر میں سوچتا ہوں میرے اندر کیڑا کیونکر پل سکتا ہے۔ یہ مجھے قطعی ناممکن لگتا ہے۔

گولی میرے منہ میں گھل گئی۔ اور میرے جبڑے دھیرے دھیرے باہم ملنے لگے میں نے اپنے سامنے پھیلی گنجان سڑک کو پھر دیکھا۔ انسانوں، رکشاؤں، ٹیکسیوں، سائیکلوں اور سکوٹروں کا ایک دریا بہتا تھا۔ سامنے حمید جنرل مرچنٹس کی دکان میں ایک آدمی موٹی سی سیاہ فریم والی عینک لگائے اخبار دیکھ رہا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنے بال سہلائے جاتا تھا، اس کے برابر چوڑی چپٹی ناک اور بے حد گھنے سیاہ بالوں اور جھکے کندھوں والا ایک لڑکا، ایک برقعہ پوش عورت کے سامنے، کاؤنٹر پر کترنوں کی رنگین ڈھکنوں اور لیبلوں والی بوتلیں رکھے جا رہا تھا۔ اور دکان کے شیشوں میں، بے شمار، چمکتے رنگ برنگ ڈبے سجے تھے۔

'حمید جنرل مرچنٹس'۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بیسیوں مرتبہ یہاں سے گذرنے کے باوجود میں اس دکان کو آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ اس دکان کے بعد سلمان شوز، امین ڈرگ سٹور اور کنگز ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ ایک نوجوان حجامت والا ایپرن پہنے، سر میں چمپی کر رہا تھا اور چمپی کرنے والے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، کنپٹیوں کی نیلی بھری رگیں پھول گئی تھیں ــــ ریڈیو پر زاہدہ پروین کافی گا رہی تھی۔ زاہدہ پروین کی آواز اور بہت سے گانے والوں کی آواز میں بڑے بڑے ہنگاموں میں،

بہت دور کھڑا بھی پہچان لیتا ہوں۔ اور مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ، مثلاً میرے دوست ہی۔ آوازوں کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے۔

سلمان شوز سے ایک دبلا پتلا آدمی چھوٹے سے بچے کی انگلی تھامے باہر نکلا بچے کے ہاتھ میں ڈوری سے بندھا جوتے کا ڈبہ تھا اور اس کی آنکھیں چمکتی تھیں۔ اس پر مجھے اچانک خیال آیا کہ میں گھر سے مخالف سمت پر نکل آیا ہوں۔ اس لئے میں گھوم کر رکشا اسٹینڈ پر پہنچا۔ تین رکشا ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دو خالی۔ ایک میں ڈرائیور اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پیتا تھا۔ آج میں نے پہلی بار دیکھا کہ رکشا عجیب جاندار شکل رکھتا ہے۔ اور یوں مجھے لگا گویا میں رکشا کو نہیں کسی اور جاندار چیز کو دیکھتا ہوں ـــــ اور یہ چیز چلتے چلتے منہ موڑ کر مجھے دیکھے گی۔ اور کراہے گی۔ جس طرح کبھی میرے اندر پلنے والا ہزار پایہ منہ موڑ کر مجھے دیکھے گا اور کراہے گا۔

ڈرائیور نے ایک لمبا کش لے کر میری طرف دیکھا۔

"کہاں جاؤ گے میاں جی"۔ اس نے بے دلی سے پوچھا۔

"سمنا باد"

"آجایئے۔ رو کے زمانہ چاہے رو کے خدائی ـــ اس نے میٹر چلا کر رکشا اسٹارٹ کیا۔

اس رکشا کی سیٹوں پر نیا نیا سرخ اور سبز پھولدار پلاسٹک چڑھا تھا۔ اور سامنے ڈرائیور کی پشت پر ایک چھوٹے سے جنگلے میں آئینہ جڑا تھا اور دائیں بائیں دروازوں کے ساتھ رنگ برنگے ریشمیں پھندنوں کی ڈوریاں جھولتی تھیں۔ ہوا بہت گرم تھی اور اس میں پٹرول اور مٹی کی مہک گھلی تھی۔ اس ملی جلی مہک پر مجھے ایک دم اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں سمنا باد جا رہا ہوں۔ سمنا باد کیا ہے؟ سمن آباد میں نے دل میں تلفظ کو صحیح کیا۔ اور تب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ میں چیزوں کے نام بھولتا جا رہا ہوں۔ اور چیزوں کے نام کھو جائیں تو چیزیں مر جاتی ہیں۔ اور میں یہ نام گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے راستے کے ہر بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کی۔ گہوارۂ ادب۔

شیخ عطاء اللہ اینڈ وکیٹ ۔ تتلی مار کر نکلی ۔ شبنم گرم مصالحہ ۔ تعویذ محبت ۔ سنگدل محبوب کھنچا چلا آئے ۔ مگر بہت سے بورڈ اور دیواروں کے اشتہار تیزی میں گذر تے گئے ۔ جنہیں میں پڑھ نہ سکا ۔ اس لئے میں نے اپنے قریب کی چیزوں کے نام یاد کرنا شروع کئے ۔ رکشا میں بہت سی چیزیں تھیں اور میرے پاس ۔ میرے اندر ۔ میرے ساتھ بہت سی چیزیں تھیں ۔ قمیض ، ٹائی ۔ ٹائی پن ۔ قلم ۔ بٹوا ۔ نوٹ ، پیسے ۔ مگر معلوم نہیں کیوں چیزیں اپنے ناموں سے الگ ہو چکی تھیں اور میں ان ناموں کو محفوظ کرنے کے درپے تھا ۔ تب سے میں ہر چیز کا نام دل میں لیتا ہوں ۔ دراصل اب میں لفظوں میں چیزیں دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے اکثر میرے ذہن میں اسموں کی ایک لمبی فہرست مرتب ہوتی رہتی ہے ۔ جیسے یہ فہرست مجھے کہیں جا کر سنانی ہو ۔

ناموں کی یہ لگن روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے ۔ کبھی مجھے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے حسد ہونے لگتا ہے ۔ پھر یہ حسد نفرت بن جاتا ہے اور نفرت ایک سیاہ جنون کی کی طرح مجھے گھیر لیتی ہے ۔ میرے ارد گرد پھیلے ان لوگوں کے پاس بہت سے ایسے نام ہیں جو میرے پاس نہیں ۔ جو کبھی میری یادداشت کا حصہ نہیں بنیں گے ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بہت سے نام چھپا چھپا کر اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں اس پر مجھے ان انسانوں سے نفرت ہونے لگتی ہے ۔ یہ ناموں کی خواہش عجب ہے کہ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے گویا میں کچھ لکھوں گا ۔ دراصل اب سے پندرہ بیس برس پہلے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں ۔ چنانچہ میں نے کاغذوں کا ایک دستہ خریدا ۔ اور اپنے میز پر لکھنے کا سامان سجایا ۔ مگر جب میں نے قلم اٹھایا تو مجھے لگا کہ شاید میں لکھنا نہیں پڑھنا چاہتا ہوں ۔ ابھی لکھنے کا وقت نہیں آیا ۔ کبھی آئے گا ۔ اس لئے میں نے پڑھنا شروع کیا ۔ مگر چند سطریں پڑھ کر مجھے لگتا کہ اب میں لکھوں گا ۔ میں قلم اٹھاتا مگر لکھ نہ پاتا ۔ دراصل مجھے کوئی ایسی چیز لکھنی تھی جس کے لئے لفظ نہیں تھے ۔ اس لئے میں قلم پھر رکھ دیتا ۔ اور سب پڑھنے لگتا ۔ پھر کچھ عرصے بعد ہی میں نے جانا کہ میں پڑھنا نہیں چاہتا ۔ اس لئے میں نے پڑھنا بند کر دیا ۔ پندرہ

برس کے بعد اب ــــ عجیب بات ہے کہ اب یکدم مجھے یوں لگا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں۔ اور لکھ سکتا ہوں۔ اسلئے میں نے کاغذوں کا دستہ خریدا۔ اور لکھنے کا سامان اپنے میز پر سجایا۔ پھر میں نے قلم اُٹھایا اور بہت سے گھنٹوں تک لکھتا رہا ــــ یہاں تک کہ میری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی، قلم تپنے لگا۔ اور انگلیوں میں جلن ہونے لگی ــــ مگر لکھ چکنے پر میں نے دیکھا کہ کاغذ پر صرف چیزوں کے نام ہیں۔ تو دراصل میں یہ لکھنا چاہتا تھا محض چیزوں کے نام۔ وہ تمام چیزیں جنہیں میں جانتا ہوں۔ جنہیں میں نے دیکھا ہے۔ جنہیں میں دیکھتا ہوں۔ اور اگر میں ان تمام چیزوں کے نام لکھ سکوں تو یقیناً سینکڑوں صفحے بھر جائیں۔ مگر مجھے اپنے اس کام کے لئے فراغت کہاں ملتی ہے۔ دن بھر کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود رہتا ہے۔ میری دیکھ بھال کو۔ مجھے دوا کھلانے کے لئے۔ حالانکہ میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ میں دوا خود کھاؤں گا۔ میرے پاس گھڑی ہے جس میں سیکنڈوں کی سوئی بھی لگی ہے۔ پھر بھی یہ لوگ ہردم میرے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں اور میں ابھی اپنی اس تصنیف کا راز کسی پر کھولنا نہیں چاہتا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ میں نے اپنے ایک لکھنے والے دوست کو بس ذرا سا اشارہ ہی دیا تھا کہ مسلسل عبارت کوئی چیز نہیں۔ لکھنے والے کو صرف اسم جمع کرنے چاہئیں۔ ہر انسان کو اپنے الگ اسم ڈھونڈ کر یکجا کر دینے چاہئیں۔ اور بس ــــ اس پر میرا وہ دوست ہنس دیا۔

"پھر تو ڈکشنریاں دنیا کا عظیم ترین ادب ہیں"۔

اور اس کی اس نافہمی پر مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ ڈکشنری میں تو محض لفظ ہوتے ہیں۔ نام نہیں۔ نام دراصل چیزیں ہیں جو انسان کے ساتھ ہیں۔ اس کے اندر ہیں۔ اور خوف یہی ہے کہ مبادا انسان اپنے حصے کی ان چیزوں کے نام فراموش کرے۔ اس لئے ہر انسان کو اپنا علم اپنی چیزیں محفوظ کر لینی چاہئیں۔ مگر یہ سب کچھ میرا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ اور اب میں راتوں کو چوری چھپے اپنی تصنیف پر کام کرتا ہوں۔ مگر جوں جوں یہ نام کاغذ پر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں میں انہیں بھولتا جا رہا ہوں۔ جیسے کوئی چیز میرے اندر سے نکل کر باہر آتی ہے۔

اور باہر آکر ختم ہوتی ہے۔ تو کیا میں چیزوں کو ختم کر رہا ہوں — اپنی جلد، اپنے لہو، اپنی ہڈیوں سے نوچ نوچ کر پھینک رہا ہوں؟ تو پھر چیزوں کو محفوظ کرنے، علم کو پالنے زندہ رکھنے کا اور کیا راستہ ہوگا؟ کہ ہم چیزوں کو پاکر انہیں مار ڈالتے ہیں۔ اسی لئے راتوں کو اکثر سوتے سوتے میں شعوری طور پر کچھ شکلیں اپنے سامنے لاتا ہوں اور پھر ان کے نام چسپاں کرتا ہوں۔ مگر بنا ناموں کے چیزوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مجھے آدھی آدھی رات کو اپنی تصنیف کے ورق اُلٹنے پڑتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں مجھے اپنے گرد بسنے والے انسانوں سے سخت بیزارخاش ہوتی ہے۔ یہ لوگ نام اپنے سینے میں دبائے ہیں۔ اور ناموں کی اس امانت کے بوجھ کا علم نہیں رکھتے اور اس لئے ان کے سینے سانسوں کے درمیان کشادگی اور فراغت کے ساتھ پھیلتے سکڑتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے اپنی تصنیف سے میرا جی اُکتا گیا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب مجھے اپنے اندر لمبے لمبے پنجوں اور سرسراتی شاخوں کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ اور میری شہ رگ میں پھندا سا لگ جاتا ہے۔ میرے جبڑے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور گندا لعاب منہ میں بھر آتا ہے جو نہ ہی اندر جاتا ہے نہ ہی باہر — اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن کچھ ایک جانب کو ڈھیلا پڑنے لگتا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی تصنیف بے کار محسوس ہونے لگتی ہے۔ نہ صرف یہ تصنیف بلکہ ہر چیز کر پنجے پھیلاتے اس ہزار پائے سے بڑھ کر کوئی نام کوئی چیز زندہ نہیں۔ یہ تمام ناموں، تمام لفظوں کا بڑھنا — پھیلنا۔ کاٹنا، نگلنا سچ ہے۔ یہ خود مفہوم ہے۔

مگر میری بیوی فوراً شیشی کھولتی ہے اور گولی نکالتی ہے۔

"لو جلدی کرو — دیکھو آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا!"

میں چاہتا ہوں کہ گولی نہ کھاؤں۔ مگر بولتے بولتے میری آواز بھی بدل جاتی ہے اور کبھی کبھی تو میری آواز بھی مر جاتی ہے۔ ایسے میں مجھے وہ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی کہانی یاد آجاتی ہے۔ اور میں اپنے آپ کو اس بدلتے لمحے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر میں اکثر آئینے سے دور رہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے کمرے میں کوئی آئینہ ہے ہی نہیں۔

اب ایک عرصے سے حجام میری شیو بناتا ہے اور جب غسل کے بعد میں آئینے کے سامنے بالوں میں کنگھی کرتا ہوں اُس وقت یہ بدلتا لمحہ موجود نہیں ہوتا۔ آخر ایک رات میں آئینہ اپنے پاس رکھا اور پھر اپنی تصنیف میں مصروف ہوگیا۔ مجھے لگتا ہے اب میرے تمام نام ختم ہوگئے ہیں۔ اب میں روز کے تین چار نام بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور قلم لے کر دیر تک بیٹھا رہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک طرح سے ناموں کا خاتمہ ہوچکا ہے کیونکہ میں انہیں اپنے سے باہر لے آیا ہوں۔ اور باہر آکر یہ لفظ بن گئے ہیں۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتا ہوں۔ سوائے ان چند لمحوں کے جب میرے اندر جان بھری شاخیں پھیلتی، رگوں کو چوستی، کلبلاتی ہیں تو اس رات میں قلم لے کر بیٹھا رہا۔ گھڑی کی سوئی ڈیڑھ پر پہنچنے والی تھی۔ اور اس وقت الارم کو بجنا تھا۔ میری بیوی رات کو دو دو گھنٹے کا الارم لگا کر سوتی ہے۔ اور مجھے دوا کھلاتی ہے۔ مگر آج میں نے ہاتھ بڑھا کر الارم کا بٹن بند کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ میرے جبڑے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے پپوٹے نیچے گرنے لگے۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے دانت ملانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں میں پسینے سے تر ہوگیا۔ پھر میرے گلے اور سینے میں کسی چیز نے کروٹ لی۔ یہ وہی کیڑا ہے جو میرے اندر پل رہا ہے۔ اس کیڑے نے اپنے لمبے لمبے پنجے میری شہ رگ میں گاڑ دیئے۔ مفہوم محض کا سیال اندھیرا سامنے امڈا۔ عین وقت پر میرے ہاتھ نے بڑھ کر آئینہ اٹھایا۔ اور اس آئینہ کو دیکھ کر مجھے ناموں کے بے فائدہ ہونے کا یقین آیا۔ میں خود اپنے ساٹھ برسوں سے زندہ تھا۔ اور اب تک محض نام سے اپنے آپ کو پہچانتا تھا۔ مگر یہ پہچان اوپری تھی۔ اس اوپری پہچان کے اندر ایک اور پہچان تھی۔ سخت چھلکے کے اندر بیج کا گودا اور اس گودے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اس لئے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی اس کی ایک پہچان ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا اور بھبک سے کچھ میری کنپٹیوں میں جل اُٹھا۔

"ارے — دو بج گئے —" میری بیوی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ اور پانی کا

گلاس میرے میز پہ لے آئی۔

"لو جلدی کرو ___ اتنی رات تک جاگ رہے ہو"۔

"ہاں" میں نے مرتی آواز میں کہا ___ "دیکھو میرا جبڑا ٹیڑھا ہو رہا ہے"۔

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ اور میری بیوی نے تیزی سے منہ پھیر لیا۔ پھر دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی مگر مجھے معلوم تھا وہ رو رہی ہے۔

"نہیں۔ دوا کو دیر ہو گئی ہے اور کوئی بات نہیں"۔

مگر ۱۳۰ روز کے بعد اپنی تصنیف سے میرا جی بالکل اچاٹ ہو گیا۔ ہر چیز کے اوپر ایک خول چڑھا تھا اور خول کے اندر ایک، گرم دھڑکتا گودا ایک ہزار پایہ تھا۔ ہر چیز شاخیں پھیلائے، رگیں مسلتے ہزار پائے چھپائے تھی۔ نام کے بے جان خول کے اندر اس لئے اب اکثر چیزوں کے نام میری یادداشت نے ٹھکرا دیے۔ اب میں کم سے کم ناموں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو بہت ضروری چیزوں کے نام بھی میری زبان پر نہ آتے۔ اور میرے بچے منہ پھیر کر آنسو پونچھتے اور پھر میرے سامنے مسکراتے اور خوشدلی سے باتیں کرتے۔

لہٰذا اب مجھے ناموں کا نہیں ٹھوس چیزوں کا خیال رہنے لگا۔ اصل وجود چیزوں کا اپنا تھا۔ ٹھوس چیزیں۔ اور ان چیزوں کو بنا ناموں کے اپنی یادداشت میں لانا ضروری تھا۔ اس لئے میں نے گھر کی مختلف چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے کوئی پرانی، بہت پرانی چیز یاد آجاتی۔ مثلاً ایک رات اچانک مجھے اپنا پرانا تمباکو پینے کا پائپ یاد آیا۔ میں سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ضروری تھا کہ میں اپنی اس چیز کو دیکھتا، چھوتا ___ اور معلوم نہیں وہ برسوں سے کہاں رکھی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اسے یاد دلایا کہ آج سے چھ سات برس پہلے جو پائپ میں پیتا تھا وہ کہاں ہے۔ میری بیوی نے آنسو بھری آواز میں کہا۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ مگر میں اصرار کرتا رہا اور اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ میری بیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں۔ میں اٹھ کر سارے گھر میں پائپ ڈھونڈتا رہا۔ صندوق۔

الماریاں، دراز۔ اور آخر وہ مجھے ردی کاغذوں کے بکس میں پڑا مل گیا۔ میں نے اُسے دیکھا، چھوا اور پھر وہیں ڈال دیا۔ اب مجھے معلوم تھا کہ وہ موجود ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو پھر۔۔۔؟ یہ خیال ہی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

مگر رفتہ رفتہ مجھے خاص چیزوں کا خیال آنا بند ہوگیا۔ اب میں کسی چیز کی نہیں یونہی چیزوں کی تلاش میں رہنے لگا۔ چیزیں۔ بے شمار چیزیں۔ ایک روز میز کے دراز میں بہت سے کاغذوں، پنسلوں اور چھوٹے چھوٹے پرزوں تلے زرد زرد کاغذ میرے ہاتھ آئے۔ زرد کاغذ جن کے اندر سرمئی چکنے ایکس رے تھے۔ مجھے یاد آیا۔ کچھ مہینے پہلے میں نے یہ ایکس رے کروائے تھے۔ میں نے ان چکنے سرمئی کاغذوں کو روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھا۔ گول گول پسلیوں کا خول۔ جس کے بیچوں بیچ کن کھجورے کی سی شاخ چلی جاتی تھی۔ اور ان پسلیوں کے اندر اندھیرا بھرا تھا۔ اور خالی پن۔۔۔ پھر خطرے کا نشان یاد دلاتی کھوپری۔ جس کے ساتھ وہی کن کھجورے کی سی شاخ چلی جاتی تھی اور جو کور جبڑے۔ ماتھے میں کھدے گڑھے۔۔۔ اور ان گڑھوں کے اندر اندھیرا بھرا تھا اور خالی پن۔۔۔ ان دونوں کاغذوں پر نیچے، کونے میں ایک نام لکھا تھا جو میرا نام تھا۔ تب میں نے جلد میں ڈھکی اپنی پسلیوں اور بالوں میں ڈھکے اپنے سر کو دیکھا، محسوس کیا، پھر اس گول گول پسلیوں کے خول کو۔۔۔ اور وہ ہزار پایہ میرے اندر اپنے پاؤں پھیلا کر رینگنے لگا۔ میری رگوں کو مسلتا اور مجھے یوں لگا وہ ہزار پایہ میری طرف منہ موڑ کر دیکھے گا۔۔۔ اور کراہے گا۔ اور یہ مفہوم محض کا سیال اندھیرا ہوگا۔۔۔ اٹل، پھیلنے والا، زندہ رہنے والا۔ ہر چیز کا اوّلین اور آخریں، واحد مفہوم۔

"دیکھو۔۔۔ دراصل میں یہ ہوں۔" میں نے اپنی بیوی سے کہا اور سرمئی کاغذ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

"ہاں۔۔۔ اب تو یہ ایکس رے کام کے نہیں۔۔۔ کہیں ڈال دیجئے۔"

اس وقت میں نے یہ جانا کہ یہ صرف میں نہیں۔ یہ میری بیوی ہے

اور بچے — دوست آشنا اور سڑکوں بستیوں اجاڑوں میں گھومنے والے سب انسان۔ اور تمام کا تمام وجود — آخر میں اس کی کوئی پہچان نہیں۔ سوائے کونوں میں لکھے اس نام کے۔ اور نام جب آدمی سے باہر آ جائے تو ختم ہو جاتا ہے۔

مگر نام کے ختم ہونے پر بھی ہر ایک کا الگ خالی پن ہے۔ یہ بہت سے خالی پن ہیں اور اپنے اندر ہم اپنے خالی پن کو پہچانتے ہیں۔ گو بظاہر ہماری نظر ہمیں اطمینان دلائے کہ ہماری کوئی پہچان نہیں۔

اس لئے اس کے بعد میری تمام تر توجہ اپنے اندر پلنے والے اس ہزار پایہ پر مرکوز ہوئی۔ میں اسے جاننا دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ کسی ایکس رے میں نہیں آسکتا کہ وہ ایک جان ہے۔ پھیلتی۔ جبڑوں بھری۔ سرسراتی جان۔ ایک روز میں کاغذوں کا ایک پلندہ سامنے رکھے بیٹھا تھا جس پر بے شمار لفظ لکھے تھے۔ مگر میں ان میں سے ایک لفظ کو بھی نہیں پہچانتا تھا کہ اچانک اس کلبلاتی جان نے میرے اندر یوں پھیلنا شروع کیا کہ میں نے جانا گویا پھٹ جاؤں گا — کچھ میرے اندر پھیل رہا تھا۔ ہر اک کا لہو چوستا۔ میں نے سانس سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور میری پیشانی سے ٹپ ٹپ پسینہ بہنے لگا۔ میری بیوی نے جلدی سے میرا منہ کھول کر دوا اندر رکھی۔ مگر میرے منہ میں زبان کی جگہ بے شمار سوئیاں بھری تھیں۔ دوا بھی ایک سوئی تھی کہ سب سوئیوں میں مل گئی — کوئی چیز میرے اندر بڑھ رہی تھی۔ پھیل رہی تھی — میری جلد پھٹنے کے قریب تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اب اس کراہ کا وقت آن پہنچا ہے۔ جو پہلا اور آخری لفظ — پہلی اور آخری آواز ہے۔

مگر میں نے ڈاکٹر کو کہتے سنا۔

"اس ہزار پائے کو ختم کر دو — اسے ہلاک کر دو۔"

نہیں نہیں — میں نے کہنا چاہا — یہ زہریلا دھڑکتا گودا — یہ

جڑوں بھرا میرے اندر — ہر مقام پر، میرے ہر مسام پر اور دنیا کے
ہر لفظ پر حاوی ہے۔ میں نے کہنا چاہا۔ مگر مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا — کچھ
کہا بھی یا نہیں — کہ آواز مر چکی تھی — اور اب یہ مجھے لے جا رہے ہیں۔ میں جانتا
ہوں یہ مجھے لے جا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ مجھے لے جا رہے ہیں۔ کہیں باہر۔
ویرانے میں — اندھیرے اور گھنے سناٹے میں۔ یہاں میرے ہزار پایے —
اس پہلی اور آخری آواز، پہلے اور آخری لفظ کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ اندھیرے
اور گھنے سناٹے میں —

ہم جنس

جب ہرے بھرے درختوں اور انسانوں کے ہجوم سے نکل کر ہم سڑک پر ہو لئے تو وہ سڑک اپنے ٹھکانے کو لیجانے والی نہیں تھی۔ اور یہ دیکھ کر میرے قدم بھاری ہو گئے۔ ابھی ہمارا آج کا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ سامنے درختوں پر جھکتا آسمان گہری سرخی میں رنگا تھا۔ ہوا کی آواز صاف ہو چکی تھی اور پتوں کا شور اونچے درختوں سے اتر کر میرے قریب قریب پھیلا تھا۔ اور یہ وقت تھا جب دن بھر کے تھکے ہارے ہم اپنے ٹھکانے کو لوٹ جایا کرتے تھے۔ مگر آج مالک ہمیں دوسری سمت کو لئے جا رہا تھا۔ شاید وہ ہمارے دن بھر کے کام سے مطمئن نہ تھا۔ اس وقت وہ میرے برابر چل رہا تھا۔ ورنہ میں اس کا چہرہ دیکھتا اور اس کے دِل کا حال مجھ پر پوری طرح کھلتا۔

چنانچہ میں سر جھکائے چلتا رہا۔ چھنن چھن چھنن میرے قدموں کی آواز پھر ہر چیز پر چھانے لگی۔ اور قدموں کی اس آواز نے مجھے اپنے سر پر سجی بے شمار چیزوں کی یاد دلائی۔ آنکھوں تک جھول آنے والی رنگین کاغذوں کی جھالر — اور ان گنت چیزیں جن کا بوجھ مجھے سر پر محسوس ہوتا رہتا ہے مگر جنہیں میں دیکھ نہیں سکتا اور جب کبھی بچے مجھے دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں تو میرے سر پر ان دیکھی سجاوٹوں کا بوجھ جاگ اٹھتا ہے۔ اب بھی، باوجود

ضبط کئے میں سر ہلائے بغیر نہ رہ سکا۔ سجاوٹ کا بوجھ، ان گنت ٹانگوں والا کیڑا بنا میرے سر پر سرسراتا رینگ رہا تھا۔ اور جب بھی ان گنت ٹانگوں والا یہ کیڑا میرے مغز میں سرسراتا ہے، مجھے بہت سی ایسی چیزیں نظر آنے اور محسوس ہونے لگتی ہیں۔ جن کا مطلب میں نہیں جان پاتا۔ اور میرے چاروں طرف دھول کے بادل اڑنے لگتے ہیں۔ اس لئے اب بھی میں نے سر جھٹکا۔ اس پہ مالک کے ہاتھ میں میری رسّی ہلی اور اس نے تیوری چڑھے چہرے سے میری طرف دیکھا۔

"ہوں۔ ہوں"۔

اور مجھے پھر یاد آگیا کہ آج میں نے اور میرے ساتھیوں نے مالک کو مایوس کیا ہے۔ اور اس خیال سے میرے قدم اور بوجھل ہوئے۔ میں نے آگے آگے چلتے، اپنے ساتھیوں کو دیکھا جو میرے ہم جنس نہیں تھے اور میری بات نہ سمجھتے تھے۔ یہ تینوں برسوں سے میرے ساتھی تھے۔ اور مالک ہمیں ایک ہی کوٹھری میں رکھتا تھا۔ مگر ہم چاروں نے کبھی ایک دوسرے کی بات نہ سمجھی تھی۔ دراصل یہ ہم جنسی کی بات نہیں تھی۔ راہ چلتے ہوئے مجھے بیسیوں ہم جنس نظر آجاتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے میں ان میں سے نہیں۔ میں تو صرف مالک اور تینوں ساتھیوں کے وجود کے ساتھ موجود ہوں۔ اسلئے میری کوئی جنس نہیں۔ میرے کرتب کا کوئی ساجھی نہیں۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر علیحدہ علیحدہ جاننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں ایک انہونی سی بات آتی ہے۔ یونہی مجھے خیال آجاتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مالک میرے گلے کا یہ پٹکا اتار ڈالے اور مجھ سے کہے ۔۔۔ "جاؤ۔ !" تو کیا ہو؟ مالک اور تینوں ساتھیوں کے بنا تو میں اپنا آپ محسوس بھی نہیں کر پاتا ۔۔۔ مگر یہ سب انہونی باتیں ہیں۔ مالک کو کیا پڑی ہے کہ ہمیں آزاد کرے۔ اور پھر جس طرح ہم اپنے مالک کے سامنے اپنے آپ کو پہچانتے ہیں کیا معلوم مالک بھی ہمارے

بغیر اپنا آپ نہ جان سکتا ہو۔

"چل چل ـــ" مالک نے میرے ساتھیوں کی رسّی ہلائی۔ ان کی جانے کیا عادت ہے کہ ڈھول سے اٹھتے راستوں میں کھانے کی چیزیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ جس روز مجھے معلوم ہو جائے کہ آج ہم نے مالک کو مایوس کیا، اس روز میں کچھ کھا بھی نہیں سکتا اور مالک کی مایوسی اور بے بسی کا بوجھ میرے اندر اترنے لگتا ہے مگر میرے ساتھی ویسے ہی مطمئن رہتے ہیں۔ پر میں کیا جانوں؟ نہ وہ میری بات سمجھتے ہیں نہ میں اُن کی۔ کیا معلوم ان کے اندر بھی مالک کی مایوسی اور بے بسی کا بوجھ اُترتا ہو۔

پھر چلتے چلتے، ایک سڑک کے موڑ پر مالک نے اچانک ہم کو روک لیا رسّی کی یہ جنبش ہم چاروں خوب پہچانتے ہیں۔ یہ رکنے کا اشارہ ہے۔ اب پل بھر میں تماشائی جمع ہوں گے اور تماشا شروع ہوگا۔ اور جوں جوں لوگ جمع ہوتے جائیں گے۔ میرے سر پہ سجاوٹوں کا بوجھ تیزی سے رینگنے لگے گا تب میرا جی چاہے گا کہ سر کو اتنا شدید جھٹکا دوں کہ سب کچھ دور جا پڑے اور پھر میں ان سب چیزوں کو دیکھ پاؤں جو یوں بے شمار ٹانگوں والے کیڑے بنے میرے مغز میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ مگر یوں کبھی نہیں ہو سکتا۔ مالک ہر روز سفر پر نکلنے سے پہلے ان چیزوں کو مضبوطی سے میرے سر پہ باندھتا ہے چنانچہ ہجوم میں گھرنے کے ایک دو لمحے بعد یہ وحشی امید آپ ہی آپ مر جاتی ہے۔ اور میں چپ چاپ سر نیہوڑائے ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جب مالک پہلا لفظ بولتا ہے تو میرے آگے پیچھے ڈھول کے بادل اُٹھنے لگتے ہیں۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ کس طرح مالک نے ہم نادانوں کو ایسے ایسے کرتب سکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ اور مجھے وہ پچھلے دن یاد آتے ہیں جب گھنٹوں ہم مالک کی چھڑی اور رسّی کی جنبش کے معنی سیکھتے رہے اور کالی بھوکی راتیں جو ہم نے اپنی کوتاہیوں کے صلے میں پائیں اور پھر اس خیال سے تھوڑا سکھ ملتا ہے کہ ہم نے مالک کی محنت کو رائیگاں

نہیں جلانے دیا۔ مگر پھر مجھے یہ خوف گھیر لیتا ہے کہ اگر اب ـــــ اس وقت پھر میں نے مالک کو مایوس کیا تو ؟ اب سے پہلے ـــــ شروع شروع میں جب میں مالک کو مایوس کرتا تھا تو صلے میں کالی بھوک کی راتیں ملتی تھیں۔ اور ان کے ختم ہونے پر جب دن کی روشنی پھیلتی تو گزرے ہوئے دکھ سے مجھے اطمینان ملتا کہ میں نے اپنی کوتاہی کی تلافی کر دی۔ مگر اب کچھ عرصے سے مالک نے عجب دستور پکڑا ہے کہ ہمارے بار بار مایوس کرنے پر بھی خاموش رہتا ہے۔ اور ہمیں پیٹ بھر کھانے کو دیتا ہے۔ اور کوئی تنبیہہ کیے بنا اگلے دن کے سفر پہ لے نکلتا ہے۔ اور اب جب میں مالک کو مایوس کرتا ہوں تو ٹھکانے پر پہنچ کر کالی بھوک کی رات کی خواہش میں نڈھال ہو ہو جاتا ہوں۔ مگر مالک کو اس کی کچھ خبر نہیں۔ میں اپنے پیٹ بھرے، خراٹے لیتے ساتھیوں کو دیکھتا ہوں۔ اور پھر گہری نیند سوتے مالک کو۔ اور اس خیال سے اداس ہو جاتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ کل بھی ـــــ اور شاید آئندہ ہمیشہ۔ ہر روز میں مالک کو مایوس ہی کرتا رہوں۔ اور کالی بھوک کی رات مجھے نہ مل سکے۔ مگر یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں نے مالک کو مایوس نہ کیا ہو۔ ہاں کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے۔ مگر نہیں مالک کی چال ـــــ اس کی باہوں کی جنبش ـــــ اس کی آواز ـــــ اس کی ہر ہر حرکت سے میں اس کی مایوسی کو پہچان جاتا ہوں۔

تو اسی دوران میں تماشا شروع ہو گیا۔ میرا ایک ساتھی بے تحاشا گول گول چکر کھا رہا ہے۔ اور بچے خوش ہو ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اور دل کھول کر ہنس رہے ہیں۔ اور اس کے بعد میرے دوسرے دونوں ساتھیوں کی باری ہے۔ وہ رسی کی جنبش پر برسوں کی سیکھی ہوئی حرکتیں دوہرائیں گے۔ اور حرکتوں کے اس سلسلے کو دیکھ کر مجھے وہ بات یاد آ گئی جو میں بار بار بھول تھا۔ مجھے جو کچھ عرصے سے اس خوف نے گھیر رکھا ہے کہ اب میں ہمیشہ مالک کو مایوس کروں گا تو یہ کچھ اس وجہ سے ہے کہ اب میں اپنے ساتھیوں کو یہ حرکتیں لاتعلق

سے دوہراتے دیکھتا ہوں۔ وہ شروع شروع کی اذیت جو یہ حرکتیں کرتے ہوئے انکے چہروں پر ہوتی تھی۔ ختم ہو چکی ہے۔ اور میں ان کے چہروں میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں۔ اور پہچان لیتا ہوں کہ میرے پھڑ پھڑاتے پٹھوں کی اذیت بھی ہولے ہولے گھل کر ایک بے معنی جنبش بن گئی ہے۔ اور ادھر مالک نے کالی بھوکی راتوں کا دستور مٹا ڈالا ہے۔ اب بھلا وہ اذیت پھڑ پھڑاتے پٹھوں میں کہاں سے لوٹے گی؟

اب مالک نے بھرے پرے تھیلے میں سے چیزیں ایک ایک کر کے نکالنی شروع کیں۔ اور تھیلا بھوکے پیٹ کی طرح نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ میرا ایک ساتھی رنگین ٹوپی پہنے لکڑی کے چبوترے سے پائے پر بیٹھا ہے۔ اور مالک کی آواز تماشے کی روداد بیان کرتے کرتے بیٹھ گئی ہے۔ اب کچھ دیر میں اس تھیلے میں سے لوہے کا وہ کڑا نکلے گا جس میں سے میرا ساتھی بار بار پھاندے گا۔ اور اس لوہے کے کڑے کو دیکھ کر میرے جسم کے پٹھے خود بخود پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ مگر اب یہ ایک بے معنی جنبش بن چکی ہے۔ وہ اذیت مٹ چکی ہے جو شروع دنوں میں لوہے کے اس کڑے کو دیکھ کر میرے روئیں روئیں میں جاگتی تھی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کڑے کے بعد میری باری ہے اور مالک یہ سب چیزیں سمیٹ کر مجھے ہجوم کے درمیان آنے کا اشارہ کرے گا۔

اور ہجوم کے درمیان آنے سے پہلے ہی اپنے کانپتے جسم پر مجھے شدید نفرت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

جب میں ہجوم کے درمیان آتا ہوں تو میرے ساتھی میری پہلی جگہ پر اطمینان سے جا بیٹھتے ہیں۔ اور ہجوم کے درمیان آتے ہوئے مجھے اپنے کپکپاتے جسم اور چھن چھناتے قدموں اور رنگین جھالروں کا خیال آتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان سجاوٹوں کے ساتھ جب میں اپنے کرتب کے عروج پر پہنچوں تو ایک بار۔ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو دیکھ پاؤں ـــــ اپنے مضحکہ خیز وجود کو ـــــ تاکہ جی بھر کے اپنے آپ سے نفرت کر سکوں اور پھر مجھے مالک کی کالی بھوکی

راتوں کی ضرورت نہ رہے۔ مگر یہ انہونی بات ہے۔ ایسا اب تک کہاں ہوا تھا جواب ہوتا۔

اب مالک میری رسّی ہلاتا ہے اور میں گھٹنوں کے بل ہو کر ماتھا زمین پر لگا دیتا ہوں۔ اور تماشائی تالیاں پیٹتے ہیں اور میرے سر کی رنگین جھالر ہوا سے ہولے ہولے میرے کانوں کے گرد لہراتی ہے۔ رسّی کی دوسری جنبش پر مجھے اٹھنا ہے اور اس کے بعد مالک اس تھیلے میں سے لکڑی کا پہلا پایہ نکالے گا اور اس پائے کو دیکھ کر مجھے ہر بار شدت سے احساس ہوتا ہے کہ مالک نے ہم کو کیسے کیسے کرتب دکھائے کہ انہونی کو ہونی کر دکھایا۔

"چڑھ جا۔ چڑھ جا۔ پہلی سیڑھی ہے — سوچ مت — ہیں؟ ابھی سے گھبرائے گا؟"

معلوم نہیں مالک نے یہ تماشے کی کیسی روداد گھڑی ہے۔ جب مجھے اپنے چاروں سموں سمیت اس چھوٹے سے پائے پر چڑھنا ہی تو مالک اپنے دکھتے گلے اور بیٹھی آواز سے یوں مجھے دلاسے کیوں دیتا ہے۔ ہمت کیوں بندھاتا ہے؟ ایک مدت تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی — مگر اب کچھ عرصے سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے مالک یہ بات مجھ سے نہیں تماشائیوں سے کہتا ہے۔ آخر اس کے بغیر وہ کیسے جان پائیں گے کہ چاروں سموں سمیت لکڑی کے چھوٹے سے پائے پر کھڑا ہونا کتنا بڑا کرتب ہے۔ اور اس پر مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ مالک کی نظر میں میرے کرتب کی عظمت ختم ہو رہی ہے۔ اب وہ بھی اس کرتب کی وقعت کو بھولتا جا رہا ہے جس طرح ہم اس کرتب کی اذیت کو بھولتے جا رہے ہیں۔ البتہ وہ خود تو مایوس ہوتا ہے مگر تماشائیوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے ڈر ہے کہ خالی کرتب تماشائیوں کو متاثر نہ کر پائے گا۔ اس لئے اُسے روداد گھڑنا پڑتی ہے۔ اور جب اپنے دکھتے گلے اور جلتی آنکھوں کے ساتھ وہ میرے کرتب میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی بے بسی پر میرا دل کڑھتا ہے۔ اور اس کو

مایوس کرنے کا خوف، پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اپنے سر پر سجاوٹوں کے بوجھ کو یکسر بھول جاتا ہوں اور میری نظر اپنے چاروں سموں اور لکڑی کے چھوٹے سے پائے کی گولائی پر جم جاتی ہے۔

"شاباش ——" اب مالک تھیلے میں سے دوسرا پایہ نکالے گا اور دھیرے سے پہلے پائے کے اوپر جمانے لگا ——

"یہ پہلی نکل گئی میرے لال، —— اب دوسری آئی —— قدم جما —— سوچ نہیں میرے لال —— پاؤں جما ——"

اب میں اپنے دونوں سموں کو اگلے پائے پر جما کر، پچھلے دونوں کو بھی ان کے ساتھ ٹکا دوں گا۔ اور محسوس کرنا چاہوں گا کہ مالک نے کیسا کرتب سکھایا کہ سموں میں اتنی سمجھ پیدا کر دی۔ اس چھوٹی سی گولائی میں ہر سم خود اپنی جگہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس دوسرے پائے پر تماشائیوں میں تھوڑی سی بے چینی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے اور اب یہ بے چینی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جائے گی۔

"آسان نکل گئی، میرے لال —— اب مشکل گھڑی آئی —— دل جما میرے لال —— ہوں ہوں —— کانپ نہیں بکرے —— ہل نہیں —— ہلنے والے کو کیا ملا ہے —— ہوں ہوں"

جوں جوں مشکل منزلیں آتی جاتی ہیں میرے کرتب کی وقعت پر مالک کا شک بڑھتا جاتا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا، مالک کو اس بات کا خوف ہے کہ میں کانپ کر گر جاؤں گا۔ مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ مالک خوب جانتا ہے میں کبھی گر نہیں سکتا۔ مجھ میں گرنے کا حوصلہ نہیں۔ وہ تو خود اس کرتب کی عظمت کے بارے میں شک میں پڑتا جا رہا ہے۔ شاید اُسے یہ خدشہ ہے کہ کہیں بالآخر یہ نہ کھلے کہ یہ کرتب کرتب ہے ہی نہیں۔ محض ایک بے معنی حرکت ہے اور اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ مشکل منزلوں کے شروع ہونے پر بھی میرے جسم میں محض خفیف سی لرزش آئی ہے تو وہ اس کرتب کی

اہمیت کا یقین کرنے اور کرانے کے لئے مجھے للکارتا ہے ـــــ "کانپ نہیں ـ ہل نہیں میرے لال ـــــ" اور میرا جسم خود بخود انتہائی شدت کے ساتھ کانپنے لگتا ہے، اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔ یہ کانپنا تو ایک بے معنی حرکت۔ ایک عادت بن چکا ہے۔ مگر مالک کا مقصد تو پورا ہو جاتا ہے۔ تماشائیوں میں ان منزلوں کے کٹھن ہونے کا تاثر پھیلنے لگتا ہے۔ ان کی بے چینی بڑھتی ہے۔ بچے اور بڑے سب کی سانس تعجب اور خدشہ سے رکنے لگتی ہے۔ مگر اس پر بھی میرے دِل میں خوشی نہیں جاگتی مجھے مالک کے دل میں سُلگتی افسردگی، مایوسی اور شک، کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور شاید اسی لئے مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں مالک کو آئندہ ہمیشہ مایوس کرتا رہوں گا۔

"پانچویں سیڑھی میرے لال ـــــ ہوں ہوں ـــــ کانپ نہیں ـــــ چڑھ جا میرے لال پل صراط نہیں بکرے ـــــ تلوار سے زیادہ تیز۔ بال سے بڑھ کر باریک ـــــ بھاری منزل ہے ـــــ پر پل صراط نہیں ـــــ ہوں ہوں ـــــ بکرے ـــــ سنبھل ـــــ کانپ نہیں ـــــ بابوجی سے چاندی پائے گا"ـــــ

اب میں تماشائیوں کے سروں کے برابر پہنچ جاتا ہوں ـــــ اور عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ اس پانچویں پائے پر تماشائی خوش ہو کر، اور خوفزدہ ہو کر دان کرتے ہیں۔ اور آخری دو پائے تھیلے میں رکھے رہ جاتے ہیں۔ رسّی کی جنبش پر میں نیچے اتر آتا ہوں اور مالک اپنی چیزیں سمیٹتا ہے اور میں اور میرے ساتھی پھر سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

مگر آج پانچویں پائے پر بھی لوگ خاموش تھے۔ اور پہلے تو مجھے اُن تماشائیوں پر حیرت ہوئی پھر ایک سہمی سی خوف بھری خوشی میرے اندر جاگنے لگی۔ میں کبھی ساتویں پائے تک نہ پہنچا تھا۔ اور اب میں نے سوچا اگر میں ساتویں پائے پر پہنچ جاؤں تو شاید میرے مالک کے دِل سے کرتب کے متعلق شک دور ہو جائے۔ یا شاید میں اس ساتویں پائے سے گر پاؤں اور میری

کالی بھوکی راتیں لوٹ آئیں ۔ یا کیا معلوم اس پائے سے میں سجاوٹوں کے بوجھ تلے دبا ۔۔۔ لکڑی کے پایوں پر سم جمائے اپنے آپ کو دیکھ پاؤں اور پھر جی بھر کے اپنے آپ سے نفرت کر سکوں اور ان کالی بھوکی راتوں کی ضرورت ہمیشہ کے لئے مر جائے ۔ اور یہ سوچ کر میرے پٹھوں میں ہولے سے وہ پرانی اذیت جاگی۔ اور اب میرا کانپنا عادت نہ تھا۔ اس کپکپاہٹ میں ایک ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی دکھن تھی ۔

" ڈر نہیں ۔۔۔ میرے لال ۔۔۔ مولا شرم رکھنے والا ہے ۔۔۔ پانچوں پائدانوں سے گزر گیا ۔۔۔ ہوں ہوں بکرے ۔۔۔ چھٹی سیڑھی سامنے آئے ۔ میرے لال آسان گزر گئیں ۔۔۔ مشکل رہ گئیں ۔۔۔ ڈر نہیں ۔۔۔ ہوں ہوں ۔۔۔ کانپ نہیں ۔۔۔ قدم جما ۔۔۔ قدم جما ۔۔۔ "

میں نے چھٹے پائے کی طرف سم بڑھائے ۔۔۔ تماشائی اب بھی خاموش تھے ۔میں نے دیکھا مالک کے ماتھے کی رگیں اُبھر آئی ہیں اور اس کی آنکھوں میں فکر مندی جھانک رہی ہے ۔ اور ایک عرصے کے بعد میں نے مالک کے ماتھے کی رگیں اُبھرتی دیکھی تھیں ۔ اور اس کی آنکھوں کی فکر مندی سے مجھے کچھ اپنے کرتب کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ اور یوں جیسے آج میں کچھ نہ کچھ ضرور پاؤں گا ۔۔۔ اور اس خیال سے میں نے اپنی نگاہیں اپنے چاروں سموں پر جما دیں ۔۔۔ اور میرا جسم اور زیادہ کانپنے لگا۔ اور سر کی رنگین جھالر اُڑ اُڑ کر ماتھے پر لہرانے لگی۔ پھر اچانک مجھے تماشائیوں کا خیال آیا جو سانس روکے مجھے دیکھ رہے تھے۔ یہ کیسے تماشائی تھے ۔ یہ کیسی بستی تھی ؟ ان میں سے کسی کو میرے گرنے کا خوف نہیں تھا ۔ اور کسی کو میرے کانپتے مضحکہ خیز جسم پر نفرت بھرا رحم نہیں آیا ۔ اور کسی نے چلا کے نہیں کہا ۔۔۔ بس بس ۔۔۔ اور کھن سے چاندی کے دو ٹھیکرے سامنے زمین پر نہیں ڈالے ۔

" ابھی نہیں میرے لال ۔۔۔ ابھی ڈیرا نہیں آیا ۔ آخری سب سے

بھاری۔ لے ہمت کر ـــ چڑھ جا بکرے ـــ ہوں ہوں ـــ ہوش کر ـــ قدم جما ـــ عزت نہ گنوا ـــ بکرے ـــ رسولؐ کا نام لے کر ـــ اور پڑے رکھنے والے کا نام لے کر چڑھ ـــ میرے لال ـــ اور بابو صاحب کو سلام کر دے ـــ ہوں ہوں ـــ پیر جما میرے لال ـــ سیس نوا ـــ اس بابو کے آگے ـــ چاندی پائے گا ـــ"

ساتویں پائے پر چڑھ کر میں نے مالک کی چھڑی کے اشارے پر سر جھکا دیا ـــ اور سر اُٹھانے سے پہلے سوچا ـــ معلوم نہیں مجھے کیا ملے گا ـــ تب تماشائیوں میں عجب طرح کا اضطراب پھیلا کہ اس سے پہلے کبھی نہ پھیلا تھا ـــ مجھے معلوم نہیں ایسا کیوں لگا جیسے میں نے کسی ہم جنس کی آواز سن لی ہو ـــ دُکھ خوف اور نفرت سے بوجھل ـــ وہ آواز جو میری اپنی ہی آواز ہو ـــ اور تب میری نظریں خود بخود اس تماشائی کی طرف اُٹھ گئیں جس کے سامنے میں نے سر جھکایا تھا ـــ اور وہاں میں اپنے آپ سے دوچار ہو گیا مالک کے اشارے سے لرزتا۔ سجاوٹوں کے بوجھ تلے دبا وجود جو چاروں سم جوڑے لکڑی کے پتلے پتلے پایوں کے مینار پر کھڑا تھا۔ اور تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے سیس نوا رہا تھا۔ اور مالک اس کے کرتب سے متعلق شک میں گرفتار ـــ چھڑی کے اشارے سے تماشائیوں کی توجہ اس کے کانپتے جسم اور ساتوں پایوں پر مرکوز کرا رہا تھا۔

اور یوں اپنے آپ سے دوچار ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل میں تماشائی ہوں اور تماشائی بن کر میں نے کھن سے چاندی کے دو ٹھیکرے مالک کے سامنے پھینک دیئے ـــ

"ایک رپورتاژ"

باہر انہونی خاموشی تھی۔

پھر کہیں کوئی چیز مجھ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی، اپنے آپ کو مجھ سے الگ نوچ رہی تھی۔ اور میرے سر کا بوجھ ایک جانب کو جھکا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھ کسی چیز کے گرد سختی سے بندھے تھے۔ یہ کیا ہے؟ میں نے سوچا میں دیکھے بغیر جانوں گا کہ میرے ہاتھوں کے درمیان کیا چیز ہے! مگر بہت دیر تک مجھے یاد نہ آیا۔ اور کوئی چیز مجھ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی، اپنے آپ کو مجھ سے الگ نوچ رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بھی بہت سوچا کہ یہ کیا ہے۔ میری زبان خشک تھی اور عرصے سے دانتوں کے درمیان ایک ہی طرح دبی تھی۔ اس کے کناروں پر دانتوں کے نشان کندہ ہو گئے تھے اور مجھے وہ چھپکلی یاد آئی جیسے برسوں برسوں پہلے، بچپن میں، میں اور میری بہن دیوار کی درز میں چھپتے دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی اس کی دم تنکا سی باہر رہ جاتی اور ہم نیم کی تیلی اس درز میں ڈالتے اور محسوس کرتے کہ اس تیلی کا دوسرا سرا چھپکلی کے جسم میں دھنس رہا ہے۔ اور ہمارے تمام جسم میں ایک جھرجھری اٹھتی، میری بہن کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور وہ بھاگ جاتی مگر میں وہاں کھڑا رہتا اور اس کا انتظار کرتا۔ ایک روز ہم بہت دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے اور آخر جب وہ ہولے سے باہر سرکی تو اس کے مٹیالے جسم میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے تھے۔ وہ کچھ دیر دیوار پر رکی رہی۔ اور پھر دھپ سے زمین پر آن گری۔ اس کی آنکھیں پتھر

سی پھیڑ گئیں۔ وہ خود بھی پتھر سی ٹھیری رہی ۔۔ ٹھیری رہی ۔ گھنٹوں ۔۔۔۔۔ شام تک ۔۔۔ اور آخر ہم نے اسے جھاڑو سے اٹھا کر نالے میں پھینک دیا۔

نالہ ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ گہرا۔ ہاں کافی گہرا، کیونکہ جب سال میں ایک آدھ مرتبہ اس کی صفائی ہوتی تو کارپوریشن کے آدمی اس میں شانوں تک اُتر جاتے تھے۔ اس نالے میں مٹیالہ، سیاہی مائل، گھنا پانی بہتا تھا اور ہمارے درخت، جو دیوار سے باہر جھک کر اس پر سایہ کرتے تھے، ان درختوں کے پتے اس میں گرتے تھے۔ اور جھاڑو سے اٹھا کر ہم نے اسے وہاں پھینک دیا تھا اور وہاں بھی وہ پتھر سی ٹھیری رہی تھی اور ہم نے دن میں تین چار مرتبہ آکر دیکھا: وہ وہیں پر تھی ۔۔۔ پھر ہم اسے بھول گئے۔

مگر آج برسوں بعد وہ مجھے یاد آئی تھی حالانکہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ میری زبان خشک اور دانتوں بیچ بند ہے اور میرے اندر سے کوئی چیز باہر نکلنا چاہتی ہے شاید مجھے بھوک لگی تھی۔ ہاں ٹھیک ہے، مجھے بھوک لگی تھی۔ شاید کافی دیر سے ۔۔۔ گھنٹوں سے، دنوں سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا کیونکہ تبھی سے باہر انہونی خاموشی تھی۔ اب بالآخر میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا: ان میں ٹوٹی چارپائی کی پٹی تھی اور میری انگلیاں اس پر جم گئی تھیں۔ میں نے سوچا: اب میں ہاتھ کھولوں گا تو اس لکڑی پر چھوٹے چھوٹے گڑھے ہوں گے۔ میں نے آہستہ سے انگلیاں کھولیں مگر وہ کچھ تھوڑا سا کھل کر رک گئیں۔ لکڑی صاف تھی، صرف نم کے دھبے پنجے کی صورت اس پر لگے تھے۔ میری انگلیاں سفید پڑ چکی تھیں اور گرفت کے انداز میں اکڑ کر جم گئی تھیں۔ ان میں کہیں کہیں سرخی کی لکیریں تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ میری انگلیوں نے کھلنا شروع کیا، ان کی سخت ٹھنڈک دور ہونے لگی۔ اور ان میں ہلکا ہلکا رنگ پھیل گیا۔

میں نے لکڑی چارپائی تلے ڈال دی اور سامنے دیکھا۔ اب تک معلوم نہیں میں کہاں دیکھ رہا تھا۔ سامنے دیکھنے سے میری آنکھوں میں جلن ہوئی اور پانی بھر آیا۔ ماں اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے سفید چمکتے چاولوں کی رکابی تھی۔

اور وہ اس پر جھکی تھی، اس کے پنجے تیزی سے چاول سمیٹ کر بے دانت کے منہ میں ڈالتے تھے اور وہ منہ ہلاتے بنا نگل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھریوں کی تہیں جمی تھیں۔ گہری گہری۔ بے حد گہری لکیریں، اور ان کے درمیان لٹکنے والی جلد۔ جس سے اس کے چہرے پر طرح طرح کے چوکور اور تکونے نقشے بن گئے تھے۔ اور مجھے یاد آیا ہوائی جہاز سے زمین ایسے ہی چوکور اور تکونے ٹکڑوں میں بٹی نظر آتی ہے۔

مگر باہر انہونی خاموشی تھی۔

میری بیوی نے چاولوں کا دیگچہ چولہے سے اتار لیا تھا اور اب دونوں بچے اور لڑکی چولہے کے گرد بیٹھے تھے۔ اور ان کے درمیان رکابیوں کا ایک دائرہ بنا تھا۔ چمکتے چاولوں کی چھوٹی چھوٹی سفید پہاڑیاں جن پر سنہری شکر کے چھینٹے تھے۔ وہ سب پنجوں کو تیز تیز — بے حد تیز چلا رہے تھے اور پنجے چاول سمیٹ کر منہ میں لے جاتے تھے۔ اور آنکھیں دوسرے کی رکابی اور منہ پر ہوتی تھیں۔

انہیں بھوک لگی تھی۔

میری بیوی دیگچے میں بچے کھچے چاول ہاتھ سے سمیٹ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اسی طرح سب سے آخر میں کھاتی تھی۔ میں نے یاد کرنا چاہا، کبھی اس نے رکابی میں کھایا تھا؟ ہاں شاید ان دنوں جب ہماری شادی ہوئی تھی کیونکہ تب ماں چولہے کے پاس بیٹھتی تھی۔ اور میری بیوی کی سینی الگ نکال کر رکھتی تھی۔

تب ماں بہری نہیں تھی۔

میں نے ماں کے مڑے تڑے، جھول آنے والے کانوں کو دیکھا جن کی لووں میں بے شمار چھید تھے اور اب ان میں صرف ایک ایک میلی چاندی کی بالی تھی۔ تب ماں کے کانوں کے تمام چھیدوں میں بھاری بالیاں ہوتی تھیں، جبھی اس کے کان جھک آئے تھے۔

باہر انہونی خاموشی سر سرائی۔ کہیں یہ ماں کا سننا تو نہیں! ہاں ماں اسی

طرح سنتی ہے۔ میں نے ماں کو پکارا۔ مگر وہ رکابی میں بچے کھچے چاولوں کا دانہ دانہ چن رہی تھی اور کھردری مڑی تڑی انگلیوں سے رکابی چاٹتی تھی۔

"کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے وہ نہیں سنتی۔" میری بیوی نے حیرانی اور غصّے سے کہا۔ اس کی آواز دبی دبی سی تھی۔ وہ اپنی آواز سنانا نہیں چاہتی تھی۔ اور مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ میں نے عرصے سے ماں کو بلانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ بہری تھی مگر آج میں نے ماں کو پکارا تھا۔

"تمہیں کیا کہنا ہے ماں سے؟" میری بیوی نے پوچھا اور رکابیوں کا ڈھیر لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکی بالٹی کے گدلے پانی سے رکابیاں دھونے لگی۔ پانی پچھواڑے کے کنوئیں سے آتا تھا۔ مگر اب پانی پر ہتھیار تانے وہ کھڑے رہتے تھے۔ جب پانی آزاد تھا تب لڑکی ڈول میں پانی بھر لاتی تھی۔ اب شام ہوئے پہ میں جاتا تھا۔ پہلی شام جب میں نے ان بہت سوں کو ہتھیار تانے دیکھا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے پکارا ماں پانی قید ہو گیا۔ میری شروع کی عادت ہے میں ہر نئی پرانی بات ماں سے کہتا ہوں اس لئے کہ وہ بہری ہے، لفظ نہیں جانتی مگر بات جانتی ہے۔ وہ میری بولی نہ سمجھتے ہوئے ہتھیار تانے میری طرف آئے۔ اگر میں چاہتا تو انہیں دکھاتا کہ پانی ان کی سنگینوں میں سے رس رس کر میرے ہاتھوں کی جانب لپک رہا ہے اور میں وہ پانی اپنی گود میں بھر لاتا، اور اس پانی میں گدلی مٹی بھری ہوتی اور وہ گدلی مٹی بھرا پانی ہمارے اندر اترتا۔ میرا جی چاہتا کہ وہ گدلا مٹی بھرا پانی میرے اندر اترے ــــ اترے اور جم جائے ــــ جم جائے اور وہ دیوار ٹوٹ جائے جسکی دراز میں میں پڑا ہوں۔

مگر ایک پانی پر اتنے بہت سوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی اور میں چلا آیا۔ جب چلا آیا تو وہ آپس میں باتیں کرتے تھے، دیکھو کنوئیں کا پانی سوکھ گیا ہے۔ کنوئیں کا پانی زمین چوس گئی ہے۔ اور میں نے جاتے جاتے دیکھا کہ کنواں ایک اندھا گڑھا ہے اس لئے میں نے گھر آ کر ماں سے کہا۔ کنواں ایک اندھا گڑھا ہے۔ ماں نے میرے ہلتے ہونٹوں کی طرف دیکھا اور اپنی کانپتی ٹوٹتی آواز میں ایک پرانا گیت گانے

لگی۔ یہ سہاگ کا گیت تھا۔ میری بیوی نے یک دم کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"ماں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کیوں؟ ماں ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں ہنسا — اور پھر میں نے ماں سے کہا:

"ماں پانی بند ہو گیا۔" میں شروع سے ہر بات ماں سے کہتا چلا آیا ہوں۔

"تم ماں سے کیا باتیں کرتے ہو؟ جس طرح ماں کو پکارتے ہو مجھے کیوں نہیں پکارتے؟" میری بیوی ہمیشہ یہی کہتی چلی آئی تھی۔

"تم تو بہری ہو۔" میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میں!" اس کی آنکھیں غصے اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مگر وہ خاموش سی ہو گئی۔

"کیا معلوم؟" اس نے آہستہ سے کہا، "اور تم؟"

"کیا معلوم؟" میں ہنس دیا۔

"اور یہ سب؟ اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا معلوم؟ جب کوئی سنتا ہے مٹی بن جاتا ہے، ماں کی طرح۔" میں نے دل میں بات پوری کی۔ اور میرے پیٹ میں اوپر نیچے بہت کچھ ہوا۔

"مجھے چاول دو۔" میں چارپائی سے اتر کر بیوی کے قریب آن بیٹھا۔ دونوں بچے کچھ الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ ان کے چہرے چھوٹے ہو گئے تھے اور آنکھیں بڑی۔ میری لڑکی کی پشت میری طرف تھی اور اس کے بال کمر تک آتے تھے۔ اس کی پشت بالکل میری بیوی کی سی لگتی تھی۔

"برتن کیوں دھوتی ہے؟" میں نے بیوی سے پوچھا۔

"ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟" میری بیوی نے چاولوں کی رکابی میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھی جھریوں بھرا تھا اور آنکھوں کے گرد نیلے نیلے دائرے کھچے تھے اور ڈھیلے کرتے میں اس کے

جسم کا کہیں نشان نہ تھا۔

"ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟ کچھ بھی نہیں لے جاؤ گے۔؟" اس نے مجھ سے پوچھا اور مجھے سب کچھ یاد آگیا: وہ سفر جو ہمیں کرنا تھا، اور مجھے یاد آیا کہ کس طرح بالآخر میں وہ لکڑی پکڑے اس چارپائی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے کہا:

"شاید ہم نہیں جائیں گے۔"

"نہیں؟" میری بیوی کی سرگوشی پر دونوں بچوں کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں اور لڑکی نے منہ موڑ کر دیکھا۔ بال اس کی آنکھوں اور منہ میں چلے آئے تھے اور ان میں سے اس کے زرد چہرے کی ابھری ابھری ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اس وقت وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے، سوائے ماں کے، کیونکہ وہ سنتی نہیں تھی۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا: اس کی آنکھوں پر اب سفید سا پردہ بھی اترتا آرہا تھا اور ان آنکھوں کے ساتھ وہ ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف منہ کر کے زور سے کہا: "نہیں۔"

مگر وہ پلک جھپکے بنا بیٹھی رہی اور میں نے ہاتھ سے چاولوں کا نوالہ بنایا۔ نوالے بنا کر کھانا بڑا لمبا اور مشکل کام ہے۔ مجھے یاد آیا برسوں برسوں پہلے ماں نوالہ بنانا سکھاتی تھی اور میں اپنی بہن سے بہت پہلے نوالہ بنانا سیکھ گیا تھا۔ حالانکہ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا اور ماں بہت خوش ہوئی تھی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سب چاول بغیر کھائے میرے اندر چلے جائیں اور میرے پیٹ میں بوجھ بن جائیں تو بہت اچھا ہو۔ مگر مجھے نوالے تو بنانے ہی تھے۔ میرے سر کا بوجھ ایک جانب کو گرا پڑتا تھا۔

"کیوں؟" میری بیوی نے پوچھا اور دونوں بچوں اور لڑکی نے سانس روک لی مگر ماں اسی طرح بیٹھی رہی۔

پھر اس نے پہلو بدلا۔

"بہو ذرا آنا۔" وہ چارپائی سے نیچے اپنی جوتی ٹٹولنے لگی۔

"مجھے بتاؤ، کیوں؟" میری بیوی نے ماں کی طرف جاتے ہوئے پھر کہا۔ چلنے پر بھی اس کے ڈھیلے کرتے میں کہیں دور دور اس کے جسم کا پتا نہ تھا۔ اور مجھے حیرانی ہوئی آخر اس کا جسم کہاں گھل گیا؟ جب وہ ماں کو گلیارے میں لے جا رہی تھی تو میں نے کہا:

"ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے۔" مجھے معلوم نہیں میں نے یہ کیوں کہا، کیونکہ ایسا سے پہلے میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ ہم کسی بھی وقت چلنا شروع کر دیں گے، رات کے اندھیرے میں، مگر اب باہر انہونی خاموشی تھی اور اس میں چلا نہیں جا سکتا تھا۔

میری بیوی ماں کو غسل خانے میں بھٹلا کے آ گئی۔

"کیوں نہیں پہنچ سکتے؟" اس نے قریب آ کر پوچھا، اور اس کی آواز کے ساتھ مٹی اور کافور کی بو لپٹی تھی۔ اس نے بچوں سے اپنی آواز چھپا کے کہا تھا۔ وہ اپنی آواز چھپانا چاہتی تھی۔ اور بچے بہت دنوں سے نہیں بولے تھے۔ میں ان کی آواز بھی بھول گیا تھا۔ اب وہاں کوئی بھی بولنے والا نہیں تھا۔ انہوں نے بولنے والی زبانیں کاٹ ڈالی تھیں اور سارے کنویں ان بولتی کٹی زبانوں سے بھر گئے تھے اور وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے: دیکھو کنویں کا پانی زمین چوس گئی ہے اور اب یہاں پتھر بھرے پڑے ہیں۔ مگر پتھر ہلتے ہیں اپنے آپ۔

کہیں سے لکڑیوں کے چٹخ کے گرنے کی آواز آئی اور بند کھڑکی کی درزیں سرخ روشنی میں چمکیں۔

"یہ کیا ہے؟" میری بیوی نے اچانک بند کھڑکی کی طرف لپک کے کہا۔

"کھڑکی کے قریب مت جاؤ۔" میں نے نوالہ نگل کے کہا۔

گلیارے سے ماں کی آواز آئی، وہ میری بیوی کو بلا رہی تھی۔

"جاؤ ماں کو لے آؤ۔" میں نے کھڑکی کے قریب کھڑی اپنی بیوی سے کہا۔ اب میرے گھٹنے ایک ٹھنڈی گیلی کپکپاہٹ سے چھو گئے۔ میں نے دیکھا بچہ ہولے سے

کھسک کر میرے گھٹنے کے ساتھ آن لگا تھا اور کانپتا تھا اور آگ کی روشنی میں اس کا رنگ ہلدی کی طرح تھا اور آنکھیں پھیل کر باہر تک آگئی تھیں، کرتے پر جگہ جگہ پسینے کے دھبے تھے۔ میں نے اپنا گھٹنا پرے کرنا چاہا مگر اس کے ٹھنڈے ہاتھوں نے میرا گھٹنا جکڑ لیا اور اس کے گلے میں سے ایک آواز نکلی۔
میری بیوی ماں کو سہارا دیئے لے آئی۔
"میں کہتی ہوں بہت سے دنوں سے گھروں میں روشنی نہیں ہوئی۔ ختم ہو گئی کیا؟ آج بھی نہیں ہے"۔ اس نے چارپائی پر بیٹھ کر کہا۔
"گھر بھی نہیں ہیں"۔ میں نے اس کی طرف منہ کر کے جواب دیا مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ وہ جب سے بہری ہوئی تھی صرف سوال کرتی تھی جواب نہیں سنتی تھی۔
دوسرے کس طرح پہنچ گئے؟" میری بیوی نے پوچھا۔ دوسرا بچہ اور لڑکی اس کے ساتھ لگے کانپتے تھے۔
باہر انہونی خاموشی اب گھل رہی تھی، کھل رہی تھی اور آوازیں ہم تک آرہی تھیں۔
تم کیسے جانتی ہو وہ پہنچ گئے؟ وہ گئے ہی نہیں تھے"۔
میں نے اکتا کر بات چھوڑ دی۔
"مگر وہ یہاں نہیں ہیں۔ میں نے انہیں خود جاتے دیکھا ہے"۔
میری بیوی نے اصرار کیا۔
"ہاں وہ یہاں نہیں ہیں مگر وہ یہیں پہنچنے کے لئے گئے تھے"۔
میں نے بات ختم کرنا چاہی کیونکہ باہر انہونی خاموشی تیزی سے گھلتی جا رہی تھی میری بیوی میرے قریب آن بیٹھی۔ اس کی سانس سے مٹی اور کافور کی بو آ رہی تھی۔ اور ڈھیلے کرتے میں دور دور تک اس کا نشان نہیں تھا۔ اس کے لمس پر میرے جسم میں جھرجھری اٹھی۔

"دیکھو، انہیں دیکھو" اس نے بچوں کی طرف اشارا کیا۔ اس وقت وہ سب زرد مٹی کے بنے تھے۔ ماں بھی زرد مٹی کی تھی اور اس کی آنکھوں پر سفید پردہ اتر رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ سیاہ کھردری جلد پر رگوں کی رسیاں ابھری تھیں۔ پھر میرے سر میں وہ گرم گرم چیز اُبلنے لگی اور میری کنپٹیاں دھڑک اٹھیں، سانس میرے سینے میں پھٹنے لگی۔

"دروازہ کھول دو" میں نے بمشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس وقت شاید میں چلاتا جیسے ایک بار پہلے چلایا تھا اور دروازہ کھول کر باہر کھڑا ہو گیا تھا، ہتھیار تانے ـــ اور اس وقت تک چلاتا اور لڑتا رہا تھا۔ جب تک کہ وہ سب کے سب میرے ہتھیار چھین کر اور سر توڑ کر چلے نہیں گئے تھے اور میں ٹوٹی چارپائی کی پٹی پکڑے رہ گیا تھا۔ رہ گیا تھا اور اس کو تھامے رہا تھا۔

"خاموش رہو" میری بیوی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر اس کے ہاتھ ٹھنڈی مٹی کے تھے جن سے کافور کی بو اُڑتی تھی۔

"ہمیں خاموشی سے چلنا ہے" اس نے میرے ہاتھ سے چارپائی کی پٹی لیتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" مجھے اس کی ہٹ دھرمی پر غصہ آگیا۔

"کہیں نہیں" بالآخر وہ مان گئی، "صرف یہاں سے یہاں تک" اس نے جلدی سے کمبل لپیٹے اور چمڑے کا پھٹا سوٹ کیس بند کیا۔

"چلو، چلو" اس نے بچوں سے کہا مگر پہلا بچہ اسی طرح زمین پر پڑا کانپتا رہا اور باہر چیخ کر گرنے والی ہر لکڑی پر اس کے گلے سے ایک آواز نکلتی تھی۔

"اسے تم اٹھا لو" میری بیوی نے دوسرے بچے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جھک کر اسے اپنی پشت پر لاد لیا۔ اس کی کپکپاہٹ میری جلد کے ساتھ سرسراتی تھی۔

"چپ ہو جاؤ، کانپو مت۔" میں نے دانت بھیں کر کہا، اس پر وہ اور زیادہ کانپنے لگا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟ ماں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کے کہا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سب نے ماں کے مڑے تڑے جھول آنے والے ہونٹوں کو دیکھا۔ وہ آنکھیں پھیر پھیر کے ہماری طرف دیکھ رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں اور سننے اور دیکھنے کی کوشش کرتی تھی جب کہ ہم باہر کی انہونی خاموشی کو کھلتے دیکھتے اور سنتے تھے۔ جو پہلے دور تھی اور اب قریب۔ میں ایک قدم ماں کی طرف گیا۔ کوئی چیز میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ میں نے جھک کر دیکھا، کتاب تھی۔ پھر اور بھی کئی کتابیں میرے پاؤں سے ٹکرائیں جو ہم نے جمع کی تھیں اور پڑھی تھیں۔ مگر ٹھنڈے گرم جسم کا بوجھ میری پشت پر تھا۔ اور اس کے گلے سے ایک آواز نکلتی تھی۔ لڑکی نے خود سے آ کر میری انگلی تھام لی۔ اس کی ہتھیلی ٹھنڈی اور کھردری تھی اور پسینے میں بھیگی کانپتی تھی۔ دروازے تک قدم بڑھا کر میں پھر رک گیا۔

"چلو۔" میری بیوی نے کہا۔ ان سب کی طرف دیکھ کر پھر وہ گرم گرم چیز میرے سر میں اُبلنے لگی جو خاموش ہو گئی تھی۔ میرے گلے میں سانس پھول گئی۔ باہر کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔۔۔ بالکل قریب۔۔۔ دروازے کے باہر۔ میں نے چلا کے کہا:

"دروازہ کھول دو۔"

مگر میری بیوی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اچانک چلا کے پوچھا اور چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ "میں دیکھ رہی تھی، دیکھ رہی تھی کمروں میں روشنیاں نہیں ہوتیں، یہ دروازہ بند رہتا ہے، کھلتا ہے تو تم مجھے گلیارے میں چھپا دیتے ہو۔ اب تم بچے کو پیٹھ پر لادے ہو۔ اور وہ دروازے کے ساتھ

داگ کر کھڑی ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔" میری دانتوں میں بھینچی خاموش زبان نے کہا۔ پھر میں نے ان چاروں کو دیکھا جو زرد مٹی سے بنے تھے اور کافور کی بو اڑاتے تھے اور میں نے اپنے کو دیکھا۔ میرے مٹیالے جسم پر گڑھے پڑ چکے تھے۔

"دروازہ کھول دو۔" میں نے اپنی بیوی کو ہاتھ سے ایک طرف دھکیل دیا، پھر کھلے دروازے کے سامنے کھڑا رہا، کھڑا رہا، یہاں تک کہ بالآخر وہ سب کے سب دروازہ دھکیل کر اندر آ گئے اور ہتھیارتا نے ہمارے پیچھے ہو لیے۔

"تم انہیں کہاں لے جا رہے ہو؟" ماں نے چلا کر کہا۔

مگر وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے دروازے سے باہر لے گئے۔ باہر میں نے ان سب کو دیکھا جو جا چکے تھے، اور اندھے کنوئیں جن میں پتھر تڑپتے تھے، اور انہوں نے میرے ہاتھ میں بھی زبانوں کے پتھر تھما دیئے اور ہم خالی اندھے منہ کے ساتھ چلتے رہے۔ میری پشت پر کا ٹھنڈے گرم جسم کا بوجھ مٹ گیا اور میرے ہاتھوں میں تھے۔ پتھر بولے اور صدیوں کے فاصلے پر میری ماں نے سن لیا۔ "اچھا۔"

وہ اطمینان سے دہلیز میں بیٹھی سہاگ گیت گانے لگی جب کہ وہ ہتھیارتا نے ہمارے پیچھے تھے اور کہتے تھے: "دیکھو زمین پانی چوس گئی ہے۔ دیکھو اندھے کنوؤں میں پتھر بھرے ہیں۔

پہچان

سب سے پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور دیکھ کر بھول گئی تھی۔ مگر جب نصرت نے مجھ سے نمائش میں چلنے کو کہا تو مجھے وہ خواب، یاد سا آیا مگر ٹھیک، سے یاد بھی نہ آیا۔ اس وقت میں منّے کی بُشرٹ پر ڈوری، سے پھول بنا رہی تھی۔ اور وہ آرام کرسی میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"کنیز اور بلقیس بھی چل رہی ہیں۔ کبھی تو گھر سے نکلا کرو۔" نصرت نے پھر مجھے گھر پڑے رہنے کا طعنہ دیا۔ اس طعنہ پر ہمیشہ کی طرح پہلے تو میرا جی کُڑھا پھر دل میں وہی ہول اُٹھا۔ انتڑیوں میں تیرتا گرم گرم بگولا۔

"ہاں ہاں چلی جاؤ کیا حرج ہے۔" انہوں نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"مگر مُنّا؟"

"کیا حرج ہے ساتھ لے جانا۔ باقی تینوں گھر رہیں گے۔" انہوں نے عینک میز پر رکھ کر ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں۔ اتنے میں تائی جی حُقہ تازہ کر کے لے آئیں۔

"اماں بھی چلی جائیں گی ساتھ۔" وہ گھڑی دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ان کے ٹینس کا وقت تھا۔ میں نے سفید نیکر اور آدھی آستینوں والی

سفید بنیان نکال کر پلنگ پر رکھی اور چائے کے لئے باورچی خانے جانے لگی۔
تب نصرت نے برقعہ پہنتے ہوئے کہا۔
"تو کل ساڑھے پانچ بجے آجاؤں گی کنیز اور بلقیس کو لے کر۔" اور سیڑھیاں اُتر گئی۔

تائی جی حقہ کی نے، مُنہ میں لئے تھالی میں چاول چُننے لگیں۔ چائے دم کرتے ہوئے میرے دل میں بار بار ہول اُٹھا اور میرا جی چاہا بھاگ کر نصرت سے کہہ دوں میں نہیں جاؤں گی۔ مگر اتنے میں وہ تیار ہو کر سیڑھیوں تک جا پہنچے۔ میں چائے کی پیالی لے گئی اور کھڑے کھڑے چائے پی کر وہ سیڑھیاں اُترنے کو تھے کہ مجھے ان کے سفید بوٹ کا ڈھیلا تسمہ نظر آیا۔ میں نے جُھک کر تسمہ کس کر باندھا اور روز کی طرح وہ مجھ سے مل کر ریکٹ پکڑ کر سیڑھیاں اُتر گئے۔
اُن کے چوڑے شانے اور مضبوط گردن اور گھنے بال ہر روز مجھے اسی طرح نظر آتے تھے۔ مگر آج ان کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر مجھے یک دم وہ بھولا ہوا خواب یاد آگیا۔

میں نے دیکھا تھا کہ میں گلی میں چلی جا رہی ہوں اور گلی بالکل سنسان پڑی ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ میں اکیلے میں ڈر رہی ہوں کہ اتنے میں سامنے سے وہ سفید کپڑے پہنے ہاتھ میں ریکٹ لئے پسینے میں شرابور چلے آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دم میں دم آتا ہے۔ مگر وہ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ اس پر میں حیران ہوتی ہوں اور برقعہ اُٹھاتی ہوں تاکہ وہ مجھے دیکھ لیں اس پر بھی وہ مجھے نہیں دیکھتے اور میرے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ میں انہیں پکارنا چاہتی ہوں اور میری آواز بند ہو جاتی ہے۔
پھر میں ان کے پیچھے بھاگتی ہوں۔ میرے قدموں کی آواز پر وہ پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہیں۔ مگر ان کا چہرہ بدل چکا ہے۔ وہ تو کوئی اور ہے معلوم نہیں کون۔ میں سہم جاتی ہوں۔ اس پر مجھے شک ہوتا ہے کہ شائد میرا چہرہ بھی بدل چکا ہے۔ پھر میں

اپنا گھر ڈھونڈنا چاہتی مگر تمام گلی کے مکان ایک سے ہیں۔
اس خواب کے یاد آنے پر مجھے اپنے سینے اور پیٹ میں خالی پن محسوس ہوا اور میرے کان سنسنا اٹھے سیڑھیوں کا دروازہ بند کرکے میں تائی جی کے پاس جا بیٹھی اور منّے کی بشرٹ سینے لگی۔ یہ تو مجھے شروع ہی سے معلوم ہے کہ ان سیڑھیوں اور اس گلی سے باہر وہ کچھ اور رہیں۔ لوگ انہیں کسی اور طرح دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ اور میں انہیں اس طرح دیکھ اور پہچان نہیں سکتی۔ اس لیے جب وہ میرے پاس ہوتے ہیں تب بھی اس گلی سے باہر ہوتے ہیں اور گلی سے باہر میں ان کو نہیں جانتی۔ اور انہیں بھی یہ سب کچھ معلوم ہے اور وہ اس سب کچھ کو ایسا ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اکثر ان کا جسم مجھے محض جسم محسوس ہوتا ہے اور میں ڈرتی ہوں۔ مگر یہ سب کچھ انہیں بھی معلوم ہے اور وہ اس سب کچھ کو ایسا ہی رکھنا چاہتے ہیں۔
چنانچہ میں تیزی سے مشین چلاتی رہی۔ مگر اب اچانک مجھے اپنے پیٹ کا سیاہ خالی پن چھبنے لگا۔ وہی انتڑیوں کو جلانے والا گرم گرم ہول منّے کے بعد سے اسی طرح بیٹھے بیٹھے مجھے اپنے پیٹ کا سیاہ خالی پن نظر آنے لگتا ہے۔ اور مجھے منّے سے پہلے کا گرم بوجھ یاد آجاتا ہے۔ جب میرے قدم زمین پر جمے جمے سے پڑتے تھے۔
اور میں نے کبھی ایسا خواب نہ دیکھا تھا جیسا کہ اب دیکھا۔ اس سے پہلے گڈو۔ نسیم اور روحی بھی تو آئے تھے مگر ان کا مجھے کچھ یاد ہی نہیں پڑتا۔ یا شاید منّا آخری ہے اس لئے سب کچھ یاد ہے۔ مگر ان تین کے وقت تو میں راتوں کو سو بھی لیتی تھی اور اکثر تائی جی ہی آکر انہیں چپ کراتی تھیں۔ مگر منّا تو راتوں کو خراٹے بھی لیتا ہے تو نیند میں مجھے اس کے رونے کی آواز آتی ہے اور جاگ کر بھی دیکھتی ہوں کہ ایک منّا پڑا سوتا ہے اور ایک منّا کہیں چلاتا ہے اور میں حساب کرتی ہوں

کہ کہیں میرا کوئی اور مُنّا تو نہیں اور مجھے بالکل یاد نہیں آتا۔ اگر مُنّا کہیں اور پڑا چلاتا نہیں تو یہ رونے کی آواز کیسی ہے؟ اور اگر منا میرے پاس پڑا سوتا اور خراٹے لیتا ہے تو وہ کون سا مُنّا ہے جو چلاّ تا ہے۔ پھر میں جاگتے میں حساب لگاتی ہوں کہ دیکھو۔ یہ میں ہوں اور یہ مُنّا ہے اور میرے پاس پڑا سوتا ہے اور اس گھر میں اور کوئی مُنّا نہیں نہ میرے اندر نہ باہر اور اس طرح میں پھر سو جاتی ہوں۔

اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب مُنّا میرے اندر تھا تو میں نے اس گلی کے بارے میں بھی کبھی کچھ نہ سوچا تھا نہ یہ گلی کبھی مجھے یوں نظر آئی تھی جس طرح اب نظر آتی ہے۔ اسی لئے وہ دن رات میں بیسیوں بار اس گلی سے باہر جاتے تھے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گلی سے باہر وہ کچھ اور ہیں اور لوگ انہیں کچھ اور طرح دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ اور میں انہیں اس طرح دیکھ پہچان نہیں سکتی۔ مجھے کبھی اس گلی اور اس کے پار کا خیال یوں نہ آیا تھا شاید اس لئے کہ تب میں خوب بوجھل تھی اور صحن اور کمرے اور تمام گھر مجھ سے بھر جاتا تھا اور ایک موٹی تہہ دار نیند مجھے آئے رہتی تھی۔ مگر منے کے بعد جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں۔ میں ہلکی ہوتی جاتی ہوں۔ دیکھنے میں نہیں۔ دیکھنے میں تو میں اسی طرح دوہرے پنڈے کی ہوں اور میں اس دوہرے پنڈے کو روز آئینہ میں دیکھتی ہوں دیکھنے میں نہیں۔ معلوم نہیں کہاں سے اور کیسے میرا بوجھ ہٹتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے پاؤں زمین سے اٹھتے جا رہے ہیں اس بات پر مجھے ہنسی بھی آتی ہے کیونکہ کل ہی روحی کہہ رہی تھی۔

"امّاں۔ آپ کی کمر پھیلتی جا رہی ہے، اور یہ بھی ایک روز کہہ رہے تھے۔ کہ ذرا کھلی بہار آئے تو صبح منہ اندھیرے سیر کو جایا کریں گے جسم چست رہتا ہے۔

"اماں۔ اماں۔ مُنّے نے چپکے سے آکر میرے گلے میں باہنیں ڈال دیں اور مشین چلاتے چلاتے میرے ہاتھ روک لیے۔
"کہاں گئے تھے ــــ ؟ اس کے ننھے ہاتھوں کی گیلی گرمی میری گردن میں جذب ہونے لگی۔
"چیزی چیزی" مجھ سے ہٹ کر وہ تائی جی کے گلے سے جا لپٹا۔
"اِدھر آ منّے ــــ یہ پہن کر دکھا" ــــ میں نے اسے بشرٹ پہنا کے دیکھی اور اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے حیرانی ہونے لگی کہ اب سے کچھ برس پہلے وہ میرے اندر تھا۔ میرا ہی بوجھ۔ اور غور کرنے پر مجھے اس کی شکل نئی نئی سی لگنے لگی۔ اس لئے میں نے اپنی نظریں فوراً ہٹالی۔
رات گئے جب وہ گھر لوٹے تو کھانا کھلاتے ہوئے میں نے ان سے کہا۔
"نصرت سے یونہی کہہ دیا۔ میرا جی نہیں چاہتا جانے کو"
نوالہ توڑتے توڑتے وہ رک گئے اور پھر اپنی وہی لاپرواہ ہنسی ہنسے جس سے مجھے ہمیشہ یوں لگتا ہے جیسے ان کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور واقعی ایسا ہوتا بھی ہے کیونکہ پاس بیٹھے ہوئے وہ اپنے کو مجھ سے الگ کئے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے جانے نہ جانے کے متعلق کچھ کہیں گے مگر وہ ہنس کر خاموش ہو رہے۔ چنانچہ میں نے خود ہی کہا۔
"معلوم نہیں کیا بُری عادت ہے میری۔ باہر جاتے ہوئے ہول اُٹھنے لگتا ہے"
"سر کی خرابی کا علاج ؟"
انہوں نے تولئے سے ہاتھ پونچھ کر کہا۔ پھر ریڈیو کا بٹن دبا کر میز پر سے کتاب اٹھائی دالان میں نسیم اور گٹو معلوم نہیں کس بات پر لڑ رہے تھے۔
"کیا ہوا ہے انہیں ــــ نسیم ــــ" انہوں نے بھاری گونجتی آواز میں پکارا۔ اور دالان میں بالکل خاموشی چھا گئی۔ صرف تائی جی کے حقے کی گڑ گڑ

باقی تھی۔ انہوں نے سگریٹ سلگایا اور کش لے لے کر کتاب پڑھنے لگے۔ میں نے ڈر کر ان کے چہرے سے نظر ہٹالی۔ غور سے دیکھنے پر ان کی شکل بھی نئی نئی سی لگتی تھی۔

اگلے روز نصرت، بلقیس اور کنیز کو لے کر آئی اور میں تائی جی اور مُنّے کے ساتھ نیچے گلی میں اُتری۔ گلی میں اتر کر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے پلٹ کر اپنے مکان کو دیکھا اور مجھے اس کی کھڑکیاں دروازے، سلیٹی چھجّہ اور سرخ دیواریں نئی نئی نظر آئیں۔ میں نے مضبوطی سے مُنّے کی اُنگلی تھامی اور ہم پانچوں یعنی۔ تائی جی، بلقیس، کنیز، نصرت اور میں قدم قدم ایک ساتھ چلنے لگے۔ یہاں تک کہ گلی ختم ہو گئی۔

باہر سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا اور سُرمئی سڑک کی آدھی چوڑان گیلی تھی اور آدھی خشک۔ سامنے نالہ۔ دور کچے میں اتر کر آخری مکانوں تک چلا گیا تھا۔ اور دِتّے حجام کی دوکان کے ساتھ چائے والی دوکان کھلی تھی جس میں ایک طرف زیوروں سے سجی کسی ایکٹرس کی رنگین تصویر لگی تھی۔ مجھے کچھ یاد سا پڑتا تھا کہ اس ایکٹرس کو میں نے کسی فلم میں دیکھا ہے مگر ٹھیک سے یاد نہیں آیا تھا۔ اس تصویر کے ساتھ شیشے میں جڑا رنگ برنگے حروف کا کلمہ شریف تھا اور ایک طرف سنہرے چوکھٹے میں آئینہ ـــ اس وقت ریڈیو بڑی اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے دیکھ لیا کہ نصرت نے وہاں تانگے کے انتظار میں رکنے کو کہا تھا۔ مُنّے کی انگلی میں نے خوب زور سے تھام رکھّی تھی۔ اب اس کے ہاتھ اور میرے ہاتھ کا پسینہ مل کر ایک ہو گیا تھا۔ میں نے بھی تانگے کی خاطر دائیں طرف نظر دوڑائی ـــ سامنے سے ایک جنازہ چلا آتا تھا۔ کالی چادر پر موتیا اور گلاب کی چادر پڑی تھی اور جنگلے والے پلنگ میں سے کورے لٹھے کی کھڑکھڑاتی سفیدی جھلکتی تھی۔ تائی جی نے فوراً بلند آواز سے کلمہ پڑھا۔ اُدھر دو دوسروں نے کندھا دینے والوں کی جگہ لی۔ مُنّے نے میرے

ہاتھ کو اور زور سے پکڑ لیا۔
"کون مر گیا ہے اماں — ؟" اُس نے برقعے کی جالی میں میری آنکھوں کو ڈھونڈ کر کہا۔
"کوئی نہیں" میں نے کہا اور جلدی سے کلمہ پڑھا۔ چائے کی دوکان میں جڑے آئینے میں سیاہ چادر اور موتیا گلاب کی سفیدی تھرتھی پل بھر کو تیری اور غائب ہو گئی۔ اور اب صرف موتیا گلاب کی خوشبو پیچھے رہ گئی تھی اور یہ خوشبو ان گجروں سے بالکل مختلف تھی جو وہ کبھی کبھی میرے لئے لایا کرتے تھے۔
"کیوں بھئی چلوگے — ؟" نصرت نے ایک تانگے کو ٹھہرا لیا تھا۔
"چلو آپا جی — پر پانچ سواریاں ہیں۔ خیر —"
نصرت اور بلقیس آگے بیٹھ گئیں اور میں تائی جی، کنیز اور مُنّے کے ساتھ پیچھے کچھ دور جا کر منّے کو میں نے اپنی گود میں بٹھا لیا تھا کیونکہ وہ چمڑے کی چکنی سیٹ پر سے بار بار پھسلے جاتا تھا۔ گود میں بٹھا کر میں نے اس کے گرد اپنی باہنہ ڈال دی۔
جب ہم نمائش کی سڑک پر پہنچے تو ہم ایسے بے شمار تانگے اور موٹریں اس سڑک پر چلے جاتے تھے اور بے شمار آدمی، بچّے اور عورتیں فٹ پاتھوں پر رواں تھے یہاں سے وہاں تک آدمیوں کا سیلاب تھا۔
"توبہ ہے کس طرح آدمی کیڑوں کی طرح چلے جاتے ہیں۔" تائی جی نے ہنس کر کہا۔
"تو اور کیا۔ کبھی کبھار تو ایسے موقع آتے ہیں" کنیز نے خوش ہو کر جواب دیا اور پہلو بدلا۔ کنیز معلوم نہیں ٹھیک سے کیوں نہیں بیٹھتی تھی۔ بے چینی سے پہلو بدلے جاتی تھی۔ کئی بار اس کی کہنیاں مجھے لگیں۔
"بالکل چیونٹیوں کی قطاریں لگتی ہیں دیکھنا رشیدہ" تائی جی نے مجھے ٹہوکا دیا اور میں نے دیکھا کہ واقعی آدمی چیونٹیوں کی قطاروں کی صورت چلے جا رہے تھے۔ چیونٹیوں کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ ایک چیونٹی دوسری سے

الگ کیونکر کی جا سکتی ہے۔ خود چیونٹیاں بھی شاید ایک دوسرے کو نہ پہچانتی ہوں اور ہم سب بھی چیونٹیوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔ مجھے اس بات پر ہنسی آگئی۔ اور میں نے غور سے دیکھا کہ ان سیاہ برقعوں میں کسی کی کوئی بھی پہچان نہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس خیال پر میری کمر میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور میرے پیٹ کا اندھیرا خالی پن نظر آنے لگا۔ مجھے پھر یوں معلوم ہوا کہ میں بے حد ہلکی ہوتی جا رہی ہوں۔ اور میرے قدموں کا کوئی بوجھ نہیں۔ میں نے منے کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

اب نمائش گاہ سامنے تھی اور رنگ برنگ بتیوں کا شہر جگمگاتا تھا۔ کہیں یہ بتیاں ست لڑے ہاروں کی طرح جھولتی تھیں۔ اور کہیں گول گول چھتریوں کے رنگ گھومتی ہیں۔ کہیں پر ان کا آبشار گرتا ہے۔ تانگہ کچھ ڈھلوان سے نیچے اتر کر ایک جگہ رک گیا۔ اور ہم نیچے اترے۔ نصرت تیزی سے چلتی ہوئی ٹکٹوں کی کھڑکی تک پہنچی اور ہم اندر جانے والے دروازے سے داخل ہوئے۔ نمائش گاہ کے اندر آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

"دیکھا بلقیس نے خوش ہو کر کہا۔ کتنی رونق ہے"۔

"ہائے ہائے کیسا اژدھام ہے"۔ تائی جی کی آواز میں خوشی بھی تھی اور خوف بھی۔

"اچھا اب اِدھر دائیں ہاتھ سے شروع کرو"۔ نصرت ایک بار پہلے بھی نمائش دیکھ چکی تھی۔ ہم ابھی شیشے کے کام والی دوکان کے قریب ہی پہنچے تھے کہ اعلان ہوا۔

"موت کا کنواں۔ موت کا کنواں۔ حضرات بس دس منٹ میں حیران و پریشان کرنے والا کرتب شروع ہونے کو ہے"۔

"اماں۔ اماں"۔ منے نے میرا برقعہ کھینچا۔ "چلو کنواں دیکھیں"۔

"اچھا اچھا۔ دیکھو میری انگلی نہ چھوڑنا"۔ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی

سے تھاما کیونکہ میرے دونوں طرف سے آدمی کھوے سے کھوا چھلاتے گذر رہے تھے۔ مگر منا ٹھٹکنے لگا۔

"کنواں۔ کنواں۔"

"اچھا چلو پہلے منے کو دکھالاؤ۔" نصرت نے لکڑی کے اس گول خول کی طرف قدم اٹھایا جسکے ساتھ لکڑی ہی کا ایک زینہ جاتا تھا اور اوپر اس خول کے دہانے پر آہستہ آہستہ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اس کے قریب ہی لکڑی کے چبوترے پر اسٹول پر گہری سرخی اور کاجل سے سجی، تنگ کالی پتلون اور سرخ جمپر پہنے ایک عورت بیٹھی تھی جس کے گلے میں سفید رومال بندھا تھا اور سنہری بال چھتے کی طرح پھولے تھے۔ وہ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی اور سگریٹ کے کش لے کر دھواں آسمان کی طرف چھوڑتی تھی جس کے چھلے کے چھلے اس کے منہ سے نکلتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بونا اپنے ہاتھوں میں گھنگھرو باندھے، بڑے سے گھیر کی شلوار اور زرد کرتا پہنے، فلمی گانوں پر ناچ رہا تھا۔ اس کا لمبا کرخت چہرہ اس کی کمر تک لٹکتا نظر آتا تھا اور جب وہ چک پھیری لیتا تو پشت پر کی کوہان پہاڑی کی طرح اٹھی نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ چوڑے چوڑے اور لمبان میں بے حد چھوٹے تھے جیسے کسی نے انگلیاں کاٹ ڈالی ہوں ــــ اور ان میں بندھے گھنگھروں کو وہ لرزا لرزا کر چھنکاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھرا کاجل رخساروں پھیل آیا تھا اور لمبی گھنی سیاہ مونچھوں پر اس کے نتھنے تیزی سے پھڑپھڑاتے تھے۔ اکثر وہ ناچتے ناچتے گھوم کر سنہری بالوں والی عورت کو دیکھتا اور مسکراتا تھا اور مسکراتے میں اس کے دانت لمبے اور چوڑے نظر آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سب سے الگ تھا۔ وہ انسانوں میں کھو نہیں سکتا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ ہم کنوئیں تک پہنچتے۔ راستے کے تالاب پر لبے انتہا بھیڑ دیکھ کر بلقیس رک گئی۔

"یہ کیا ہے ؟" بلقیس نے اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ تالاب کے کنارے کھڑے سب لوگ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم نے اوپر نظر اٹھائی اور آسمان سے باتیں کرتی لوہے کی سیڑھی کے سرے پر ایک آدمی موٹے موٹے تہہ دار کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ وہ آدمی اتنی بلندی پر تھا کہ جہاں پر روشنیاں پیلی پڑ جاتی ہیں۔ اسے دیکھنے کیلئے ہم سب کو گردن بہت پیچھے تک جھکانی پڑی۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی گردن کے منکے کی چبھن محسوس ہونے لگی۔

"یہ کیا ہے ؟" منے نے میرا برقعہ کھینچا۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔

"دیکھو یہ آدمی آگ لگا کر چھلانگ لگائے گا" میں نے اُسے بتایا۔

سیڑھی پر کھڑے آدمی نے بوتل کا تیل اپنے اوپر چھڑکا۔ اس کے بعد سب کو جھک کر سلام کیا۔ میرے ساتھ کھڑی موٹے شیشوں کی عینک والی عورت نے اپنی عینک ناک پر درست کی اور اس کے ساتھ کھڑے بچے نے کہا۔

"اب کیا ہوگا؟ کیا کر رہا ہے؟ عینک والی عورت نے اپنا تھکا سر جھکا کر کہا۔ "کچھ نظر نہیں آرہا ــ" اور اپنا تھکا سر پھر سے اونچا کر کے دیکھنے لگی۔ اور شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں بے حد دھندلی تھیں۔ سیڑھی پر کھڑے آدمی نے ماچس کی جلتی تیلی اپنے کپڑوں سے چھوائی اور پل بھر میں وہ آگ کا بگولا بن گیا۔ اس کے بعد وہ بگولہ اپنے مقام سے گرا اور دھڑام سے تالاب میں آن گرا۔ تالاب کے گندے پانی پر تیل کے چلتے ناچنے لگے اور کچھ آدمی کنارے پر، تالاب سے نکلتے اس آدمی کو سہارا دینے کیلئے بڑھے اور دیکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

"بس ــ ؟ اماں کنواں ــ کنواں ــ" منے نے میرا برقعہ کھینچا۔ مگر اب مجھے کچھ اپنا آپ ٹھیک سے یاد نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ میرے چاروں طرف بے شمار لوگ تھے اور سوائے اس بولنے اور اس آدمی کے جس نے آگ لگا کر چھلانگ لگائی اور اس عورت کے جو لکڑی کے چبوترے پر بیٹھی تھی اور ایک کرتب اپنے

اندر رکھتی تھی۔ کسی کی پہچان نہیں تھی۔ میری انتڑیوں میں بار بار وہ گرم ہول اٹھ رہا تھا۔ شاید مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

اب ہم موت کے کنوئیں کی طرف بڑھے۔ مگر اس وقت تک ایک شو ختم ہو چکا تھا اور دوسرے کے لئے ابھی تماشائی جمع ہو رہے تھے۔ یونا اب پھر ناچنے لگا تھا۔ مگر وہ سنہری بالوں والی عورت نہیں تھی۔ قریب ہی شامیانہ تھا جس کے دروازے پر سفید پردے پر بڑے بڑے سرخ حروف میں "اصلی لڑکیوں والا سرکس" لکھا تھا اور نیکر پہنے لڑکیوں کی تصویریں بنی تھیں۔ کینز اس شامیانے کے قریب رک گئی۔

"دیکھو گی؟" نصرت نے پوچھا۔ ابھی کینز نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ خاکی پتلون اور سفید بشرٹ پہنے، گنجے سر والا ایک آدمی "آیئے۔ آیئے۔" کہتا ہوا ہماری طرف بڑھا اس کی چچپاتی آنکھیں نقابوں کے پیچھے ہمارے چہرے ٹٹول رہی تھیں۔ اور ایک برقعے سے اس کی نظر دوسرے کی طرف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف جاتی تھی۔

"بس شروع ہونے والا ہے۔ صرف آٹھ آنے۔ صرف آٹھ آنے۔"

کچھ لوگ اس پردے سے اندر جا رہے تھے۔ پھر پردہ ذرا سا اٹھا تو کرسیوں کی قطار سے پرے، بیچ میدان میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں سرخ نیکر اور چھوٹے چھوٹے نیلے جمپر پہنے کھڑی تھیں۔ ان کے رنگ سانولے تھے اور آنکھیں پھیلی پھیلی۔ سوکھے بازو، اور سوکھی ٹانگوں کے درمیان ان کی پسلیوں کے ڈھانچے سانس لیتے تھے اور ایک لڑکی الٹی ہو کر اپنی ٹانگوں اور ہاتھوں کے بل کمان کی طرح کھڑی تھی جب کہ دوسری پسلیوں کے محراب دار پنجرے پر کود رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنی پسلیوں میں دھمک محسوس ہونے لگی اور منے کی پسلیوں میں بھی میں نے منے کی پسلیوں کو ٹٹولا اور فوراً اس دروازے سے ہٹ گئی۔

"اماں۔ کنواں۔ کنواں" منے نے پھر میرا برقعہ کھینچا۔

"اچھا۔"

مگر ابھی موت کا کنواں شروع ہونے میں دیر تھی اور قریب ہی ہنڈولوں میں سواریاں بھر رہی تھیں۔

"چلو ہنگھوڑے میں بیٹھیں"۔ نصرت نے مجھے ہنڈولوں کی طرف کھینچا۔

"نہیں۔ مُنا ڈرے گا۔" میں نے کہا۔

"اسے میرے پاس چھوڑ دینا"۔ تائی جی نے لکڑی کے بنچ پر بیٹھ کر کہا۔

میں نے ابھی کچھ فیصلہ نہ کیا تھا کیونکہ مجھے بہت عرصہ پہلے کوار پتے میں جھولا ہنڈولا یاد آرہا تھا۔ اور وہ ہول جو اس کی اتران کے وقت دل میں اٹھتا ہے مگر اتنے میں نصرت ٹکٹیں بھی لی آئی، اور ہم چاروں ہنڈولے میں بیٹھ گئے ابھی دو ہنگھوڑے خالی تھے اور ان میں بھی سواریوں کو بیٹھنا تھا۔ خالی ہنڈولا زمین کی طرف آیا تو ہمارا سب سے اوپر پہنچ گیا۔ اب سب بتیاں ہم سے نیچے تھیں اور ان بتیوں کے باہر تاریک شہر پھیلا تھا۔ نمائش گاہ ایک کھلونا نظر آتی تھی۔ اور آدمی رینگتے کلبلاتے کیڑے۔ اوپر پہنچ کر مجھے اپنے بوجھ کے ختم ہونے کا ڈر آیا میں نے نیچے ہجوم میں مُنے کو پہچاننا چاہا۔ مگر مجھے اپنی سمت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں میں ان کو کس سمت پر چھوڑ آئی تھی۔ میں نے موت کا کنواں ڈھونڈنا چاہا اور وہاں سے مجھے سمت کا اندازہ ہوا۔ میری نظر بالآخر ایک سفید برقعے پر رکی جس کے اندر تائی جی تھیں اور ان کے ساتھ مُنا جس نے نیلی بشرٹ اور نیکر پہن رکھی تھی۔ میرا خیال تھا مُنا مجھے ضرور دیکھے گا مگر اس نے میری طرف نگاہ نہ اٹھائی۔ شاید وہ غباروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے پکارا۔ "مُنے۔ مُنے"۔ مگر اس تک میری آواز نہ پہنچی۔ اور معلوم نہیں اس وقت کہاں سے مجھے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ کوئی منا ایک ہی سانس میں بے تحاشا چلائے جا رہا تھا۔ اور مجھے یوں لگا کہیں اس اژدھام میں میرا ایک مُنا رو رہا ہے مگر میں نے حساب کیا کہ اس کے علاوہ میرا کوئی مُنا

نہیں۔ نہ ہی میرے اندر نہ ہی باہر۔ میرا مُنا تو نیچے کھڑا تھا اور غباروں سے کھیلتا تھا۔ تو پھر یہ کون مُنا تھا جو رو رہا تھا؟

اب ہنڈولا چلنے لگا۔ نیچے اوپر۔ نیچے اوپر — دنیا چکر کھانے لگی اور ہر بار اس کی اتران پر گرم ہول میری انتڑیوں کو مسلنے لگا اور مجھے اپنے پیٹ کا خالی پن بار بار نظر آنے لگا۔ جب ہنڈولا اترتا تو سب کی سب سواریاں خوف اور اذیت سے ملی جلی چیخیں مارتیں اور چیخ کے بعد ہنسنے لگتیں۔ نصرت، بلقیس، کنیز بے تحاشا ہنس رہی تھیں — مگر میں چکر کھاتے ہنڈولے میں مُنے کو ڈھونڈتی رہی کہ وہ میری طرف دیکھتا ہے یا نہیں۔ مگر اُس نے ایک بار بھی نظر نہ اٹھائی۔

جب ہنڈولا رکا اور ہم اترے تو میں نے دیکھا کہ تائی جی تو اس سے بالکل مختلف سمت میں بیٹھی تھیں۔ جہاں میں ان کو دیکھتی رہی اور مُنا ان کی گود میں بیٹھا ٹافیاں کھا رہا تھا۔ اور میں حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی کہ میں کس کو دیکھتی رہی۔ اور بعد میں بھی میری نظر ان کو ڈھونڈتی رہی۔ مگر وہ بچّہ اور عورت مجھے کہیں نظر نہ آئے۔

اب موت کا کنواں شروع ہونے کو تھا اور لکڑی کے چبوترے پر سنہری بالوں، سرخ جمپر والی عورت بیٹھی سگریٹ کے کش لے رہی تھی اور مسکراتی تھی اور بونا کمر تک لٹکتا منہ اور پہاڑی ایسی کوہان لئے۔ کٹے ہاتھوں سمیت ناچ رہا تھا۔

"چلو۔ چلو۔" بلقیس لکڑی کے زینے کی طرف بڑھی۔ اور مُنے کا ہاتھ پکڑ کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ہم سب لکڑی کے خول کے دہانے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ نیچے گہرائی میں دو موٹر سائیکلیں رکھی تھیں ایک سُرخ، دوسری سبز۔

"یہ کنواں ہے؟" منے نے پوچھا۔

"ہاں۔"

اس لکڑی کے خول کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور دو آدمی چست پتلونیں اور آدھی آستینوں کی سفید بنیان پہنے داخل ہوئے۔ پھر سرخ جمپر اور کالی پتلون پہنے۔ سرخی سے سجی سنہرے بالوں والی عورت آ گئی اور ان دونوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ ان دونوں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کئے اور اُن کے شور سے سب دیکھنے والوں کی اور پوری نمائش کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ وہ دونوں کچھ دیر تک نیچے زمین پر گول گول چکر کاٹتے رہے اس کے بعد سبز موٹر سائیکل کے پیچھے سنہری بالوں والی عورت بیٹھ گئی۔ اور دونوں موٹر سائیکل تیز تیز چکر کھاتے لکڑی کی دیواروں پر چڑھ آئے۔ اور لکڑی کی دیواریں ان کی رفتار کے ساتھ ساتھ جھول کھانے لگیں۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ سائیکلیں اس خول سے باہر آن گریں گی اور جب وہ دہانے کے قریب پہنچتیں تو سب پیچھے ہٹ جاتے۔ پھر سنہری بالوں والی عورت نے اچانک مرد کی کمر سے ہاتھ کھینچ کر بازو ہوا میں پھیلا دیئے اور گردن پیچھے ڈال کر مسکرانے لگی۔ اس کی گردن کی رگیں تنی تھیں اور بھورے بھورے دانت بجلی کی روشنی میں چمکتے تھے۔ اسی طرح وہ کنوئیں کے چکر کھاتی رہی۔

"اوئی توبہ" کی آوازیں چاروں طرف سے آتی رہیں۔ میرے دائیں بائیں سیاہ برقعے کھڑے تھے۔ اتنے قریب کہ مجھے خود بھی یاد نہ آ رہا تھا کہ میں کونسے برقعے میں ہوں۔ یوں بھی موٹر سائیکلوں کی آواز سے میرا سر ہلکا کاغذ ہو گیا تھا اور تماشے کے شروع ہوتے ہوتے، ہجوم اتنا بڑھ گیا تھا کہ مجھے اپنے آپ پر کتنے ہی انسانوں کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور جب کوئی اور سانس لیتا تو مجھے لگتا میں سانس لے رہی ہوں۔

جب موٹر سائیکلیں زمین پر آن رکیں اور ان تینوں نے جھک کر سب کو سلام کیا اور لکڑی کے چھوٹے سے دروازے کے راستے سے باہر نکل گئے اور کنواں خالی رہ گیا تو سب نے لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنا شروع کیا۔ ہم نے

اپنے سے پہلے ہجوم کو اتر جانے دیا۔ اور جب ذرا بھیڑ کم ہوئی تو پہلے نصرت اس کے بعد باقی سب نے اترنا شروع کیا۔ پہلی سیڑھی اترتے ہوئے میں نے منے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اتارنا چاہا۔
مگر مُنا کہاں تھا؟ مُنا ——؟ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ منا نہیں تھا۔
"مُنا —— مُنا کہاں ہے ——؟" میں نے اپنے سے اور سب سے کہا۔
"ارے مُنے؟" تائی جی نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر ہم سب نے بیسیوں بار پورے کنوئیں کے چکر لگائے مگر مُنا کہیں نہیں تھا۔
"مُنا کہاں ہے؟" میں نے پھر کہا۔ مگر مُنا کہیں نہیں تھا۔
اس کے بعد ہم نے دوکان دوکان مُنے کو ڈھونڈا۔
"نیلے کپڑے ہیں نا اور سُرخ بوٹ؟" بلقیس نے پوچھا۔
"ہاں۔ ہاں" میں نے کہا۔
"اللہ حافظ۔ اللہ حافظ" تائی جی مجھے دلاسا دیئے جاتی تھیں۔ دوکان دوکان مجھے نیلے کپڑے اور سُرخ بوٹ نظر آئے۔ مگر مُنا کہیں نہیں تھا۔ اور انسانوں کے ہجوم میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے شک ہونے لگا۔ مُنا تھا بھی یا نہیں۔ کیا وہ سچ مچ تھا۔ کیا مُنا تھا اور کھو گیا؟ یا وہ تھا ہی نہیں اور کھو گیا اچانک مجھے چلتے چلتے اپنا آپ بوجھل لگنے لگا۔ جیسے تمام نمائش گاہ مجھ سے بھر گئی ہو۔ میرے پیٹ کا اندھیرا خالی پن بھر چکا تھا۔ کیا مُنا تھا؟ مجھ سے الگ۔ میں نے سوچا۔ یا میں نہیں ہوں اور مُنا تھا۔ اور اگر ہم دونوں الگ الگ ہیں تو پھر کھو کیسے سکتے ہیں؟
نصرت نے کہا۔ "رشیدہ نمائش والوں کے دفتر چلو۔ وہاں سے اعلان کرواتے ہیں۔ یوں بھی کھوئے ہوئے بچے وہاں پہنچا دیئے جاتے ہیں"۔
ہم باہر جانے والے دروازے کے قریب ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے۔ سرخ میز پوش والی میز کے گرد کرسیاں ڈالے چار آدمی بیٹھے تھے۔ ہم

ان کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

"جی فرمایئے ـــ" ان میں سے عینک والے نے کہا۔

"ہمارا بچہ کھو گیا ہے۔" نصرت نے کہا۔

"اوہ تشریف رکھیئے ـــ" اس نے میز کی دراز میں سے کاپی پنسل نکالی۔

"کیسا بچہ ہے ـــ عمر ـــ کپڑے ـــ شکل وصورت ـــ کوئی نشانی۔

نام ـــ بول سکتا ہے؟"

جب میں نے یاد کرنا چاہا تو مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ مگر تائی جی نے ان کو بہت کچھ بتایا۔ پھر عینک والا بہت سی دیر تک اعلان کرتا۔ اور نمائش گاہ میں اس کی آواز پھیل گئی۔ اس نے ہم سے انتظار کرنے کو کہا۔ ہم بیٹھے رہیں۔ اور تائی جی بہت کچھ پڑھتی رہیں اور کنیز، اور بلقیس اور نصرت مجھے دلاسا دیتی رہیں اور دفتر میں بیٹھے آدمیوں نے مجھے چائے پلانا چاہی۔ مگر چائے کا ایک ہی گھونٹ چپکتی کڑواہٹ بن کر میرے حلق میں اٹک گیا۔ اور میں کھڑکی سے باہر انسانوں کا ہجوم دیکھنے لگی۔ صرف بونا نہیں کھو سکتا۔ اور آگ لگا کر تالاب میں کودنے والا آدمی اور موت کے کنوئیں کے سوار اور اصلی لڑکیوں والا سرکس کی لڑکیاں ـــ باقی کسی کی پہچان نہیں۔ مجھے وہ خواب یاد آیا کہ میں گھوم کر دیکھتی ہوں اور تمام گلی کے مکان ایک سے ہیں۔ مگر اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے دروازے میں منا کھڑا ہے۔ میں نے بولنا چاہا اور نہ بول سکی۔ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" تائی جی لپک کر اٹھیں۔

"کدھر گیا تھا منے ـــ ہیں ـــ کون چھوڑ گیا ہے ـــ؟" کنیز نے منے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ہیں ـــ؟ وہ ـــ" منے نے انگلی سے خالی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور جیب سے ٹافیاں نکال کر گننے لگا۔

میں نے منے کا ہاتھ پکڑا اور ہم نمائش سے باہر چلے آئے۔

"کہاں رہ گئے تھے ــــ ہیں ؟" تائی جی نے اصرار کیا۔

"ہیں ــــ ؟ کہیں نہیں ــــ" منا اب میری گود میں بیٹھا تھا۔" میں تو اماں کی انگلی پکڑے چل رہا تھا۔ پھر جب آگے جا کر میں نے اماں کو دیکھا تو وہ کوئی اور تھا۔ اماں نہیں تھیں"۔

"وہ کون تھی ــــ ؟" میں نے منے سے پوچھا۔

"پہلے اماں تھی۔ پھر آگے چل کر نہیں تھی"۔

"ننھی جان ــــ شاید برقعے کے بھلاوے چلا گیا"۔ بلقیس نے کہا۔

مگر دھندلی سڑک کا سفر طے کرتے ہوئے مجھے پیچھے نمائش گاہ سے منے کے رونے کی آواز آتی رہی۔ جب کہ منا میری گود میں بیٹھا ٹافیاں کھا رہا تھا۔

"وہ کون تھی ــــ ؟" اپنی گلی میں پہنچ کر جب کہ کالی چادر پر پڑے موتیا گلاب کی خوشبو ابھی تک وہاں بکھری تھی۔ اور چائے کی دوکان میں ایکٹرس اسی انداز سے زیوروں سے سجی ہنستی تھی ــــ اور ایک سی گلیوں کے ایک سے مکانوں میں ایک سی روشنی بھری تھی۔ میں نے پوچھا ــــ اور مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے پوچھا اور رات کے اندھیرے میں جب کہ میں اور منا تنہا تھے ــــ میں نے پوچھا۔ وہ کون تھی۔ "پہلے اماں تھی ــــ پھر نہیں تھی"۔

منا صدیوں تک یہی جواب دے گا۔

-:-

"کمرہ"

وہ کُل چار تھیں ۔ تیسری منزل کے اس چوکور۔ چھوٹے کمرے میں دو دو میزوں کی قطار میں وہ کل چار تھیں۔ دو دو، برابر برابر بیٹھا کرتیں۔ وہ چاروں وقت کی بے حد پابند تھیں ۔ حیرت ہے کہ وقت کی اس قدر پابند تھیں ۔ بلکہ وقت سے پہلے ہی وہاں اپنی نشستوں پر موجود ہوتیں۔ انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو ایک ساتھ زینہ چڑھتے یا پھر لفٹ میں نہ دیکھا تھا۔ مگر جب بھی کوئی ایک وہاں داخل ہوتی تو تینوں پہلے ہی سے موجود ہوتیں۔ اسی لئے کسی نے آج تک وہ چوکور چھوٹا کمرہ خالی نہ دیکھا تھا۔ اور کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ چوکور چھوٹا کمرہ خالی ہونے پر کیسا نظر آتا ہے۔ اور اس کی دیواریں ان چاروں کے عدم موجودگی میں کیسی ہوتی ہیں یہ بات ان چاروں نے ہمیشہ الگ الگ اپنے طور پر محسوس کی تھی۔ مگر حسبِ عادت یہ بات بھی انہوں نے کبھی ایک دوسرے سے نہ کہی تھی۔ اتنے برس ایک ساتھ کام کرتے کرتے گویا وہ زبانِ خاموشی جان گئی تھیں۔ اب نہیں جانیں تھیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا۔ شاید ہمیشہ ہی سے جانتی تھیں۔ شاید ان کا کام ہی ایسا تھا کہ ایک گہرا سناٹا، دبیز، تہہ دار خول کی طرح ان کی زبانوں اور کانوں کے گرد تن جاتا تھا اور نہ کہتے ہوئے بھی بہت سے لفظ خود بخود لڑھکتے، سرکتے، اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ سروں پہ چلنے والے اس پنکھے کی طرح گھوں گھوں کرتے

سرسراتے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ،

وہ کہ ان میں کی تیسری تھی۔ اگر دروازے میں داخل ہوتے ہی داہنے سے گننا شروع کیا جاتا۔ تو وہ کہ جوان میں کی تیسری تھی۔ اکثر یہی سوچتی کہ آخر ان باقی تینوں کو یہاں کیوں آنا پڑا۔ وہ کہ لباس، شکل وصورت سے بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھیں۔ (کیونکہ اس تیسری کا اپنے متعلق خیال تھا کہ وہ لباس اور شکل وصورت سے ٹھیک ٹھاک نظر نہیں آتی) تو پھر ان کو بھلا اس ملازمت کی کیا آفت آن پڑی تھی۔ ان میں سے پہلی کی صورت تو بہت ہی اچھی خاصی تھی شفاف رنگ، چہرے کے گرد سیاہ بال کھلے کھلے سے گردن پر پڑے رہتے۔ اور اونچی سی ناک میں ذرا سی کیل دم دم چمکتی، سوائے اس کے کہ اوور ٹائم کرنے سے اس کی آنکھوں کے گرد انتہائی گہرے اور سیاہ گڑھے پڑ چکے تھے۔ شاید وہ شہر کے بہترین علاقے میں کسی خوبصورت مکان میں رہتی تھی اور کسی بہت بڑے افسر کی بیوی تھی۔ یا شاید ان دونوں میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ مگر شکل وصورت سے وہ اتنی درست تھی کہ اسے شہر کے بہترین علاقے میں ایک بہترین افسر کی بیوی ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد، کچھ عرصے سے، ان سیاہ حلقوں کے علاوہ، باریک، نامعلوم سی جھریاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ یہ سب اس لئے اس نے دیکھا تھا کہ وہ بالکل اس برابر والے میز پر تھی۔ —— کبھی کبھی تو یہ میز اس قدر قریب محسوس ہوتا کہ اس کے سانس کا اتار چڑھاؤ، اسے اپنے میز میں اپنے ہاتھوں کے نیچے محسوس ہوتا اور اسے یوں لگتا جیسے اس کے ہاتھ میز پر نہیں، بلکہ کسی زندہ جسم پر رکھے ہوں۔ اور وہ گھبرا کر وہاں سے ہاتھ اٹھا لیتی۔ انہیں اپنی کرسی کی پشت پر رکھے تولئے سے پونچھتی۔ ذرا ہوا دکھاتی اور پھر کام میں لگ جاتی۔ مگر کنکھیوں سے یہ بھی دیکھتی جاتی کہ پہلی والی کے ہر ٹانکے میں کس قدر نفاست اور مہارت ہے اور اسے اپنے کام کے ٹانکے گویا زخموں کے سیے جانے والے ٹانکے نظر آنے لگتے۔ سیاہ چھوٹے چھوٹے، غلیظ، بال نما کیڑا ٹانکے، کٹے

ہوئے۔

معلوم نہیں ان باقی دو کا کام کیا تھا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ کبھی آج تک ان کے کام پر تنقید نہ ہوئی تھی۔ تحسین تنقیص بس کام کر کر کے وہ سامنے کھڑکی کے قریب پڑی ٹوکری میں ڈالتی جاتیں۔ اور اس میں آج کے دن کے کام کا سامان رکھا ہوتا۔ وہ چپکے سے، باری باری اپنا اپنا سامان اٹھاتیں۔ اپنے اپنے میز پر آتیں اور کام شروع کر دیتیں۔ اول، تو آج تک، انہیں اس کام کی سمجھ ہی نہ آئی تھی۔ ان کے سامان میں ایک ایک تیز قینچی، ایک، باریک کاغذ پر بنا عجیب وغریب سمتوں والا خاکہ اور ایک سفید کپڑے کا ٹکڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ دھاگے۔ رنگین اور سفید کاغذ کا وہ خاکہ انہیں کپڑے پر اُتار کر دوہرا کر کے کاٹنا اور پھر سینا ہوتا اور پھر اس کی سلائیوں کا کنارہ رنگین تاگوں سے مضبوط کرنا ہوتا اور بس،

ایک دو برس تک، تو ان میں کی تیسری والی کی سمجھ میں یہی آیا کہ یہ کسی لباس کا ایک حصہ ہے۔ شاید آستین ہے یا پھر گریباں ہے کہ دامن، بہر حال اس نے سوچ میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا دراصل اس ملازمت کا مل جانا ہی اسے بے حد غنیمت لگا تھا۔ جب اس نے اس ملازمت کے لئے درخواست بھیجی تھی تو آس پاس کے لوگوں نے اسے یہی سمجھایا تھا کہ بھئی واہ۔ ایسی ملازمت اور ہم؟ بھائی بہت مشکل کام ہے۔ خوامخواہ کیوں شرمندگی مول لیتی ہو۔ اول تو درخواست وہاں تک پہنچے ہی گی نہیں۔ اور اگر پہنچ بھی گئی تو سمجھ لو کہ رسید نہیں ملے گی اور اگر رسید مل گئی تو انٹرویو کے لئے بلاوا تو مت آیا۔ اور اگر آبھی گیا تو سوائے اس کہ بھیجہ اُدھڑوا کے آجاؤ اور کیا ہو گا۔ مگر یہ سب کچھ ہو گیا۔ حیرت کی بات تھی کہ ملازمت کے لئے درخواستیں اتنی کم آئی تھیں کہ سب کی سب درخواستوں والیوں کو ملازمت بغیر کسی انٹرویو اور امتحان کے دے دی گئی۔

اور پہلے دن جب وہ پہلی منزل میں اس ادارے کے دفتر پہنچیں تو وہ بس یہی چار

تھیں۔

دفتر میں چاروں طرف بھاری چھتیں ڈلی تھیں۔ جن کے پیچھے نیلے استر لگے تھے اور وہاں سے کرم خوردہ کاغذ کی سیلی مہک آتی تھی۔ اور دن میں بھی وہاں رات کا سا گھنی تاریکی کا سماں تھا۔ جبھی تو ایک مدھم دیا سا بلب چھت کے ساتھ لٹکا تھا۔ اور ایک اس سے بھی مدھم، میز پر رکھے لیمپ میں لگا تھا۔ سامنے گھومنے والی کرسی میں ایک شخص بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھوں پر اس تاریکی میں بھی سیاہ چشمہ تھا۔ اور سیاہ چشمے سے ان میں کی تیسری ذاتی ہمیشہ ہی سے خوفزدہ تھی۔ جیسے ان شیشوں کے پیچھے آنکھیں نہ ہوں۔ آنکھوں کی جگہ دو خالی گڑھے ہوں۔ اور ان گڑھوں کی تاریکی میں کہیں لمبے لمبے کیڑے کلبلاتے پھرتے ہوں۔ روشنی میں آنے کو۔ چنانچہ وہ شخص گھومنے والی کرسی میں بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں پر اس سیلے کرم خوردہ اندھیرے میں بھی سیاہ چشمہ تھا۔ اور ایک دیا سا مدھم بلب چھت کے ساتھ لٹکا تھا۔ اور ایک اس سے بھی مدھم میز پر لیمپ میں جلتا تھا۔ اور اس لیمپ کے نیچے۔ اوپر نیچے کچھ کاغذات تھے۔ اسے تو وہ بھی کرم خوردہ ہی نظر آئے۔

"معاف کیجیے گا۔ میری آنکھوں میں کچھ تکلیف ہے روشنی برداشت نہیں کرتیں۔"

"جی کوئی بات نہیں۔" ان چاروں نے بیک زبان کہا تھا۔ چنانچہ اس شخص نے کرسی پر نہایت تیزی سے گھوم گھوم کر کہنا شروع کیا۔

"اپنے کام کی نوعیت کا کچھ اندازہ تو آپ کو ہوگا ہی۔ اخبار میں تھا۔ یہ ملاپ کا کام ہے۔ ٹکڑے جوڑنے کا سمجھ لیجیے۔ ادھر چاروں منزلوں میں یہی کام ہوتا ہے۔ آپ کو روز کا کام روز ملا کرے گا۔ دفتر کے وقت میں اسے پورا کرنا ہوگا۔ ہاں اگر کوئی چاہے تو باقاعدہ درخواست دے کر۔ زیادہ کام لے کر اوور ٹائم بھی کر سکتا ہے۔ اس کا نہایت معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد شاید آپ کو کچھ بھی دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ تنخواہ کا چیک پہلی کی پہلی

آپ کو مل جایا کرے گا۔ وقت کی پابندی نہایت لازمی ہے۔"

تب اس دن وہ چاروں ایک ساتھ اس کرم خوردہ دفتر سے نکلیں۔ باہر آئیں تو سفید روشنی تیز کٹار سی آنکھوں میں اتر گئی۔ اُف کیسی دردناک روشنی ہے۔ شاید ان سب نے ایک ساتھ کہا یا سوچا تھا۔ اور یہ بھی سوچا تھا کہ وہ دفتر میں، گھومنے والی کرسی پر بیٹھنے والا شخص سچا ہی ہے کہ سیاہ چشمہ چڑھائے رکھتا ہے۔ باہر دروازے کے پاس اسٹول پر بیٹھے چپڑاسی نے انہیں راستہ بتایا۔

"بی بی جی۔ اِدھر داہنے کو جا کر ــــ باہنے کو گھوم کر سیدھا چلتی جائیں۔ زینہ آئے گا۔ بس تیسری منزل پر آپ کا کمرہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ آتا، مگر دیکھیے گھٹنے کا حال۔ سوج کر کیا ہو رہا ہے۔ اُٹھنا محال ہے۔"

مگر اس روز وہ چاروں کی چاروں سیدھی گھر گئیں۔ ان میں کی تیسری والی نے کمروں کے خالی فرشوں کو دیکھا۔ اور سوچا کہ چلو اور کچھ نہیں ان پر قالین تو بچھ ہی جائیں گے۔ اور یقیناً باقی تینوں نے بھی یہی کچھ سوچا ہوگا۔ ورنہ ان پر کیا آفت تھی اس ملازمت کی۔ وہ پہلی والی نے تو یقیناً یہ ہیرے کی کیل اسی طرح بنائی تھی۔ کیونکہ جب وہ یہاں آئی تھی تو اس کی خوبصورت اونچی سی ناک خالی تھی۔ اب معلوم نہیں انہیں یہاں آئے کے برس ہو گئے تھے۔؟ اس نے اکثر حساب لگانا چاہا مگر بیچ ہی میں رہ گئی۔ البتہ قینچی پکڑ پکڑ کر انگلیوں کے جوڑوں پر گٹھے پڑ گئے تھے۔ اور سوئیاں چبھ چبھ کر مستقل چھید پوروں میں کر گئی تھیں۔ کبھی کبھی ان چھیدوں کی گہرائی پوری کی پوری نظر آنے لگتی۔ سفید ہوتے گلابی گوشت میں اترتا لمبا باریک سا چھید۔ اندر گہری اندھی سرخی میں اترتا چھید نیچے کہیں نیچے۔ سرسراتے نامعلوم کیڑے یا شاید تاگے۔ ریشہ ریشہ ان زخموں کے کنوؤں میں اتر گئے تھے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ آخر ان لوگوں کو انگشتانے کیوں نہیں دیئے جاتے؟ مگر وہی کام کی زیادتی اور وقت کی تنگی وہ سوچ سوچ کر رہ جاتی۔

اور زخم اندر کنوئیں کی طرح۔ اندر ہی اندر اترتے گئے۔

اور وقت تو بس اس دن ہی سے۔ پہلے دن ہی سے ایسا تنگ تھا کہ سورج ہمیشہ پیلی دھوپ لئے ہی دیواروں پر سے سرکتا نظر آتا رہتا۔ کبھی کھل کر چمکیلا اس کمرے میں نہ اترا تھا۔ حالانکہ روشندان تھے۔ کھڑکیاں تھیں۔ مگر وہی ایک ملگجا، آندھی زدہ، خاک نما اجالا تھا کہ اس کمرے میں ہوتا۔ باہر کا حال کسے معلوم تھا؟ صبح پیلی دھوپ میں وہ اس کمرے میں داخل ہوتیں اور شام ڈھلتی دھوپ ہی میں گھر لوٹتیں۔ اور گھر میں بھی در و دیوار پر پیلی دھوپ ہوتی۔ اور بس بہت سی چیزوں اور باتوں اور انسانوں کے گزرنے کا سا سماں ہوتا اور ایک عجلت ہوتی۔ جلدی جلدی کام نمٹانے کی۔ وہ کام کہ جن کے نہ نمٹانے سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑ رہا تھا۔

تو بس ان ہاتھوں میں پڑے گٹھوں اور پوروں میں کھدے کنوؤں ہی سے وہ اندازہ لگاتی کہ آخر کے برس گزر گئے ہوں گے اور ہر بار ہی اس کا حساب غلط ہو جاتا۔ شاید پانچ یا چھ۔ نہیں یہ تو کچھ بھی نہ ہوئے۔ تو کیا پھر دس ـــــ بارہ ـــــ نہیں ـــــ اسے یاد آتا جب وہ پہلا دن تھا تو اس دوسری والی کے رخسار بھرے ہوئے تھے۔ اور دانت سفید برابر موتیوں کی لڑی کے سے تھے۔ یہ اس نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ منہ سے دھاگہ توڑتے ہوئے اس کے خوبصورت دانت نہایت صاف ستھرے موتی سے چمکتے نظر آتے۔ اسی لئے اس کا دہن اور نیچے ٹھوڑی اور گردن کا حصہ بہت خوبصورت تھا اور کبھی کبھی وہ اس سڈول گوری گردن میں ایک نازک سے موتی والی زنجیری پہنتی تھی۔ جو اس پر بہت بجتی تھی۔ تو اس پہلے دن اور اس کے بعد بہت سے دن اس دوسری والی کے رخسار بھرے ہوئے تھے۔ اور کنپٹیوں پر اس طرح گڑھے نہ تھے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نہ نکلتی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر اس دوسری والی پر نظر ڈالی تو کیا پھر ان برسوں نے ... بہت زیادہ برس ـــــ؟ پھر اس کو یوں لگا۔ جیسے بس ایک صبح سے ایک شام تک

صبح کی پہلی دھوپ سے شام کی پیلی دھوپ تک۔ مگر چھوٹے چوکور کمرے میں پھیلے دبیز خاک، نما سناٹے کو چوتھی کی گونج دار، جھنجھلاتی کھانسی نے توڑا —— اُف! ایک لمبا سا ایڑا اس کی گردن سے اتر کر کمر میں سرسراتا گیا۔ اس نے چوتھی کے اندر کو دھنستے شانے اور باہر کو نکلتی پسلیوں کو دیکھ کر سوچا۔ یہ تو ازل ہی سے ایسی تھی۔ نہ معلوم اس کو ملازمت کیسے مل گئی۔ حیرت ہے کہ اس ملازمت میں صحت کی چھان بین بھی نہ کی گئی تھی۔ یہ تو شاید دواؤں کی خاطر یہاں تک آئی! مگر پھر بھی، دیکھو۔ شوخ رنگ، اور گہرا میک اپ، کرنے سے باز نہیں آتی۔ ہڈیوں کے ڈھانچے پر منڈھی زرد کھال اور کیڑے کھائے پھیپھڑوں والی چیز، جس کے منہ سے ہر دم کروڑوں لمبے لمبے کیڑے نکل کر چھوٹے چوکور کمرے کے خاک، زدہ، زرد اُجالے میں قلابازیاں کھاتے پھرتے تھے۔ یہ چیز تو بس ازل ہی سے ایسی تھی۔ چیختے چلاتے رنگوں اور سنہری اونچے سینڈلوں اور عنابی لپ سٹکوں اور نیلے پیلے آئی شیڈوں اور لمبے لمبے مردہ سفید ناخنوں کو کیوں اس طرح برہنہ رکھتی ہے۔ گستاخی کی حد تک برہنہ کہ جب منہ میں تاگا ڈال کر یہ اپنے ہاتھوں سے توڑتی ہے تو اس کے برہنہ مردہ ناخن اس کے برہنہ مردہ دانتوں سے ٹکرا کر عجب طرح کی آواز پیدا کرتے نظر آتے ہیں اور سانس کے ساتھ کیڑوں کے بھپکے قلابازیاں کھاتے۔ اچھلتے کودتے نکلتے نظر آتے ہیں۔ گویا اس کے چھلنی پھیپھڑوں کی قید سے نکل بھاگے ہوں۔ مفلوج ذہن بچوں کی طرح۔ تو پھر اس چوتھی سے تو وقت کا اندازہ لگانا محض حماقت ہے۔ یہ تو ازل ہی سے ایسی تھی۔ دفع کرو۔ اس نے نظر بھر کے پھر پہلی کی طرف دیکھا اور پھر اس بات پر دکھ کیا کہ اوور ٹائم کر کر کے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے تو پڑے ہی تھے۔ اب ان کے گرد جھریاں بھی آ گئیں۔ معاً اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں پر پڑ گئی۔ جن پر پھولی پھولی رگیں، نیلا ہٹ لئے ہوئے رگیں جال کی طرح پھیلی تھیں۔ تو پھر شاید اس سے زیادہ یا پھر محض ایک دن، یا دو دن۔ اس سے زیادہ نہیں۔ مگر حیرت تو یہ تھی کہ آج تک وہ چاروں چپ چاپ اپنا کام کرتی

چلی آئی تھیں۔ اور اس کام پر کبھی تنقید، تحسین یا تنقیص نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ پہلی والی ان سب سے بہتر کام کرنے والی تھی۔ اس کا کام سب سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ اور وہ چوتھی وہ اپنے کرم خوردہ سانسوں کے ساتھ کرم زدہ ٹانکے ہی بھرتی تھی۔ اور پھر اس کے ہاتھوں میں عجیب گدلا پسینہ آتا تھا کہ ہر چیز کو غلیظ کر دیتا تھا۔ اور ان دونوں کے بیچ ان دونوں کا یعنی تیسری اور دوسری کا کام تھا۔ بے جان ایک سا۔ اچھا نہ برا۔ بس خانہ پری۔ اور پھر ان سب کے کام کی کوئی تحسین تھی نہ تنقیص، بس وہ ایک ٹوکری بھرتی تھی اور خالی ہو کر پھر بھر جاتی تھی۔ ریت گھڑی کی طرح اور بس ــــ نہ معلوم کے برس گزر گئے تھے۔

وہ دن بہت الگ۔ سب دنوں سے انوکھا تھا۔ اس روز دھوپ کا رنگ تیز زرد تھا۔ اور آنکھوں میں زیادہ چبھتا تھا اور اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ سیاہ چشمہ لے لے مگر سیاہ چشمہ سے تو وہ ہمیشہ ہی سے خوفزدہ تھی۔ اور اس نے آئینہ میں دیکھا تھا کہ اس کی ہلکی بھوری دھندلی سی آنکھیں ابھی آنکھیں تھیں اور خالی سیاہ کھڈے نہ تھے کہ ان پر سیاہ چشمہ چڑھایا جاتا۔ مگر وہ دھوپ تو بہت تیز تھی نوکیلی برچھی کی سی کرنوں والی۔ جب وہ زینہ طے کر کے اس چھوٹے چوکور کمرے میں پہنچی تو دہلیز میں اس کے قدم رک گئے۔ وہ تینوں سیاہ چشمے چڑھائے بیٹھی تھی۔ وہ چپکے سے ٹوکری میں سے اپنا کام اٹھا لائی۔ مگر اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور متلی کا سیاہ سمندر اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا تھا اور سیاہ جھاگ اڑاتا تھا۔ اس نے پہلی کے خوبصورت چہرے کو نظروں سے ٹٹولنا چاہا۔ کم از کم تم کو سیاہ چشمہ نہیں چڑھانا چاہیئے تھا۔ کہ تم جو لباس اور شکل و صورت سے اتنی ٹھیک ٹھاک نظر آتی ہو۔ مگر آج اس کا خوبصورت چہرہ بڑے بڑے سیاہ شیشوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ اس نے بد دل ہو کر روشندان کی طرف دیکھا پیلی دھوپ کی تیز کرنوں کا راستہ سا تھا۔ اور اس میں خاک کے ذرّے تھے۔

قارون کا غارت زدہ خزانہ تھا کہ جوتھی کے سانس میں پلنے والے کیڑے اسے اپنے ہاتھوں میں پکڑا وہ خاکہ اور کپڑے پر اس کی نقل عجیب سی لگی۔ آخر یہ کیا چیز ہے؟ اس نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید کسی لباس کی آستین ـــ نہیں ـــ یہ تو کسی کھلونے کے کان لگتے ہیں۔ وہ زور سے ہنس دی۔ اگر ان تمام چاروں منزلوں میں یہی کام ہوتا ہے۔ یعنی ہر منزل میں مختلف ٹکڑے ہی جوڑے جاتے ہیں۔ تو پھر یہ کیوں نہیں کہ ایک ہی کام والا تمام ٹکڑے جوڑے۔ اور ایک لباس یا جو کچھ بھی یہ ہے۔ وہ تمام کا تمام تیار کرے۔ اسے خیال آیا تو کیا یہ سب تینوں کی تینوں یہ نہیں سوچتیں۔ ؟ اس نے کہا۔

"دیکھو ـــ معلوم نہیں یہ ٹکڑا کیا ہے کہ ہم بناتے ہیں تو پھر کیوں نہ ان چاروں منزلوں میں بیٹھنے والے تمام کے تمام وہ چیز ـــ پوری کی پوری خود بنائیں ـــ جس کا یہ ٹکڑا ہے؟"

چنانچہ اس سب سے الگ، انوکھے دن اس کا جی ذرا بھی کام میں نہ لگا۔ یہاں تک کہ دفتر کا وقت تمام ہوا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے اپنا ادھورا کام ٹوکری میں رکھ دیا اور گھر چلی آئی۔ اور پھر روز ہی ایسا ہونے لگا۔ نہ معلوم کتنے دن ـــ یا شاید برس ـــ اس کے ساتھ والیوں تینوں نے کبھی اس کی بات نہ سنی۔ اور اسی طرح اپنا کام وقت پر پورا کرتی رہیں۔ مگر اتنے برسوں سے اس انوکھے دن کے بعد سے وہ روزانہ وہی ایک ٹکڑا ٹوکری میں سے اٹھاتی اور تمام دن اس کو دیکھتی رہتی ٹانکے بھرتی اور ادھیڑ ڈالتی کہ آخر یہ کس چیز کا حصہ ہے اور کس چیز میں لگ کر یہ خود بھی مکمل ہو جائے گا۔ اور وہ چیز۔ کوئی بہت بڑی چیز ـــ جو صرف اسی ایک ٹکڑے کی منتظر ہے کہ اس کے بغیر ادھوری ہے تو پھر وہ چیز۔ بڑی چیز بھی مکمل ہو جائے گی۔ اور الگ ٹکڑا نہ ہو گی۔ اور آنکھ اسے دیکھے گی اور پہچانے گی اور جانے گی۔ مگر یہ خواب سے اس کی آنکھوں میں تیرتے رہتے اور اس کی کارکردگی صفر کے برابر رہ گئی۔ مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود اس کو کوئی

فہمائش نہ کی گئی اور اس کا معاوضہ نہ کٹا۔ اور وہ جو برابر کام کرتی رہیں۔
ان کی بھی تحسین نہ ہوئی اور وہ اسی ادھیڑ بن میں رہتی۔ اس ٹکڑے کو الٹا
سیدھا، اونچا، نیچا کر کے۔ الٹ، پلٹ کے دیکھتی کہ کیا ہے — ؟

ایک روز زینہ طے کرنے سے پہلے اس کی نظر پہلی منزل میں دبیز چھتوں
والے دفتر کے باہر۔ اسٹول پر بیٹھے چپراسی پر رک گئی۔ اوہو — یہ تو سوچا
ہی نہیں۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"بابا — یہاں — تمام منزلوں میں کام ہوتا ہے؟ کتنے کہ لوگ ہونگے؟"

چپراسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

"کیا پوچھتی ہو بی بی — بے شمار ہی نفوس ہیں۔ گنتی کیا ہوگی؟"

"تو بابا سامان بن کر کہاں جاتا ہے؟"

"بڑے صاب کے پاس اور کہاں؟ مگر تم کن جھگڑوں میں پڑ گئیں۔
جاؤ اوپر دیر ہو رہی ہے"

اتنے ہی بڑے بڑے بکسے، بند — زنگ آلود قفلوں کے ساتھ۔ ٹرالیوں
پر لدے دفتر کے اندر پہنچائے جانے لگے۔

"اچھا تو یہ تیار شدہ مکمل جنس ہے!" اس نے زیر لب کہا۔ اور چپراسی
اپنے سوجے گھٹنے کو سہلانے لگا۔

وہ زینہ طے کر کے چھوٹے چوکور کمرے میں اپنی سیٹ پر پہنچی۔ برسوں پرانا
وہ ٹکڑا اس نے ٹوکری میں سے نکالا۔ اور اس میں ٹانکے بھرنے لگی۔ سوئی
سوئی آنکھوں اور چلتے پھرتے خوابوں کے ساتھ چنانچہ اگلے روز وہ زینے طے کرنے
کی بجائے اس دبیز چھتوں والے کمرے کے پاس پہنچی۔ اور چپراسی سے وقت لئے بغیر
اندر داخل ہو گئی۔

اندر دن کے وقت بھی رات کا سماں تھا۔ کمرے میں کرم خوردہ کاغذ کی سیلی
مہک تھی۔ اور ایک دیا سا بلب چھت سے لٹکتا تھا۔ اور ایک اس سے بھی مدھم

میز پر رکھے لیمپ میں تھا۔ اور اس کے نیچے کاغذوں کا پلندہ تھا۔ اور سامنے گھومنے والی کرسی پر وہ شخص بیٹھا تھا اور اس تاریکی میں بھی اس نے سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ اس نے کہا۔

"سر ــــ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آخر کیوں نہ ہم"

"میں جانتا تھا کہ تم ہی آؤ گی ــ بس ایک تم ــ"

اس کی آواز میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ کاغذوں کے پلندے پر تھا۔ سب سے اوپر اس کی درخواست تھی اور اس پر ایک سرے سے دوسرے اور دوسرے سے پہلے تک، سرخ روشنائی میں موٹے قلم سے کاٹے کا نشان تھا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ دیکھو ــــ اس نے اپنا سیاہ چشمہ اتار دیا۔ وہ پچھلے قدموں ہٹی۔ تب اس نے دیکھا کہ وہ تو تیسری منزل کے اسی چوکور چھوٹے کمرے میں اکیلی ہے کہ اس کی دیواریں نہیں ہیں۔ اور ایک اندھا سناٹا ہے۔ اور ہنچائی ــــ وہ پچھلے قدموں ہٹتی چلی گئی ــــ ہٹتی چلی گئی ــــ آخری قدم تک اور اس سے بھی آگے۔

"سایہ"

اسٹیشن پر اس قدر ہجوم کہ گویا تمام دُنیا ہی مسافر ہوگئی۔ عجب معاملہ ہے۔ اسپتال میں جاؤ تو جیسے تمام خلقِ خدا آزار میں گھری ہے"۔ چھڑی ٹیکتا وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتا اور پھر اترتا گیا۔ آنے جانے والے اندھا دھند۔ اپنی اپنی آشفتگیوں کے اسیر، اس سے ٹکراتے۔ اسے دھکیلتے، بڑھتے چلے گئے۔ اس درجے کے تیز رفتار تھے۔ سب کے سب" گرم گرم سانسوں کی بھاپ اس کے چاروں طرف اڑتی چلی گئی۔ وہ مزے سے دھکوں کے اس ریلے میں بہنے لگا۔ عجلت میں نہ ہونا بھی کتنا نیا احساس تھا۔ چنانچہ آج اس کو شانوں پہ دھرا اپنا یہ سر بڑا ہلکا محسوس ہوا۔ جیسے لکڑی کا ہلکا پھلکا، ٹوٹا پھوٹا، بے کار فراموش کردہ تختہ مزے سے، ہولے ہولے ہلکورے کھاتا پانی پر بہتا چلا جائے۔ بہتا چلا جائے اور کوئی بھی اس کو روکنے، پکڑنے، دیکھنے اور دیکھ کر پہچان کر پرانے خاک زدہ سٹور میں رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ شیطان، فتنہ سیرت بچے بھی اس کے پیچھے نہ بھاگیں۔ واہ۔ یہ آزادی یوں جسم کا بوجھ ختم کر دیتی ہے کہ انسان ہواؤں میں پرزہ پرزہ کاغذوں کے ساتھ اُڑتا پھرتا ہے۔

"سامان نئیں ہے جی ———؟ وہ سرخ پگڑی والا قلی نہ معلوم کہاں سے اس کی تاک میں تھا۔ اس نے چھڑی کی لوہے دار نوک زمین میں گاڑنی چاہی۔ مگر شاید اس کی گرفت ہی ایسی ڈھیلی تھی یا پھر وہ پلیٹ فارم ایسا سخت لوہے کے سے پتھر کا

تھا کہ چھڑی بھی فرش پر تیرتی ہی رہی۔ واہ

"میاں سامان نہیں ہے! وہ یہ جواب دے کر خود بھی حیران سا ہوا۔ ہاں حیرت ہے یوں بھی کوئی سفر کرتا ہے؟ اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی نہ کرے۔ یہ بات آج ہی اچانک بجلی کے کوندے کی طرح اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ سفر بغیر ارادے اور تیاری کے بھی ہو سکتا ہے اور یہ سب سے بڑی آزادی ہے کہ انسان اٹھے اور اٹھ کر چل دے۔ چل دے اور سیدھا اسٹیشن پہنچ کر جس ریل میں چاہے سوار ہو جائے اور جہاں جی چاہے اُتر جائے۔ چنانچہ اس لہر کے ساتھ ہی وہ جاگی جاگی نیند سے ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ گیا اور روانہ ہو گیا۔ صد شکر کہ اس جلتی جلاتی دوپہر میں کوئی بھی اس کو نہ دیکھ پایا ورنہ وضاحتیں، معذرتیں بہت تھکا دینے والا سلسلہ ہیں اور تھکن کا سیاہ سایہ تو یوں اس کے پیچھے لگا تھا کہ کسی پل جُدا ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ تھکن بھی عجیب تھی۔ یہ نہیں کہ وہ تھکن کا عادی نہ تھا۔ اس کا تو اس سے ازل کا ناطہ تھا۔ مگر وہ ٹینس کے سیٹ پر کھیلنے پر تھکن کا سرور اور تھا اور پھر فیلڈز میں میلوں میل پیدل چل کر سر دے کرنے میں جسم کا ٹوٹنا اور رنگ رکھتا تھا۔ ان تھکانوں میں ایک نشہ تھا گہرا — جسم کو آسودگی بخشنے والا۔ وہ مہربان نیند کی مانند تھکن کہ ایک دم بخار کی طرح چڑھ کے پھر جسم کو آسودگی بخشتی تھی۔ گہری، ٹھنڈی، میٹھی، آسودگی مگر یہ تھکن — اس میں ہڈیاں گداز کرنے والی ایک بے بسی تھی۔ یہ تھکن ایک آسیب کی طرح منہ کھولے بڑھتی چلی آئی تھی۔ ایک سپردگی چاہتی تھی۔ اندھی سپردگی اور سپردگی تو بڑے حوصلے کی بات ہے چنانچہ جب تک انسان کے اندر سکت ہے وہ اس سپردگی کے آسیب سے بچتا ہے۔ بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہے کہ سپردگی اپنے آپ کی نفی کرنے کو کہتی ہے اور اپنا آپ تو اپنے آپ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں کبھی کسی کی خاطر — کبھی کسی انتہائی جانگداز لمحے میں ایک ثانیہ کے لئے یوں ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی اتنے برسوں کی

زندگی میں کبھی یوں نہ ہوا تھا۔ اور ہوش و حواس کا حصار تو شروع ہی سے اس کا ایسا مضبوط تھا کہ کیا کہا جائے۔ تو اب یہ ہڈیاں گداز کرنے والی ایک تھکن تھی کہ مکمل، اٹل، لاانتہا سپردگی کا تقاضا کرتی تھی اور اپنے سیاہ پر پھیلائے اس کے سر پر سایہ سایہ منڈلاتی تھی۔ جہاں وہ جاتا تھا۔ جہاں وہ ہوتا تھا اور وہاں بھی جہاں وہ نہ ہوتا تھا۔

بس اسی لئے اس نے شکر کیا کہ اس جلتی جلاتی دھوپ بھری دوپہر میں کسی نے اس کو یوں نکلتے نہ دیکھا۔ اور وہ طویل معذرتوں اور وضاحتوں کے چکر سے بچ نکلا اور اپنی اس چالاکی پر وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

"کونسے ڈبے میں جائیے گا آپ؟" قلی ابھی تک اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"میاں وہ جو سامنے ریل کار ہے۔ بس اسی میں چلا جاؤں گا۔ اس نے ذرا اپنی رفتار تیز کرنا چاہی۔ مگر قدم تھے کہ زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے گویا تیرتے چلے جاتے تھے۔ اس کے نہ چاہنے پر بھی قلی نے ڈبے کی اونچی سیڑھی اسے سہارا دے کر چڑھائی۔ چھوٹے سے تنگ راستہ سے گزر کر اندر کی ٹھنڈک بہت بھلی لگی۔ اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اللہ اللہ۔ حد ہے۔ گویا تمام دنیا ہی مسافر ہوگئی۔ شروع سے آخر تک سیٹیں رُکی تھیں۔

"کیا نمبر ہے جناب سیٹ کا!" اب کے سفید وردی پوش عینک ناک پر ٹکائے آیا ــــ

"میاں نمبر دمبر تو کچھ نہیں"۔

"اچھا تو چانس پر سیٹ لیجیئے گا۔ مل جائے گی۔ یہ جو رش آپ کو نظر آرہا ہے مسافروں کا نہیں۔ یہاں مسافر ایک ہے تو چار اس کو رخصت کرنے والے ہیں۔ آپ یہاں تشریف رکھیں۔ فی الحال ـــــ؟

وردی پوش نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر پنسل کی نوک پھیرنی شروع کی۔ وہ قریب کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"واہ ——" عجب طرح کی نشست تھی کہ نیچے ہی نیچے دھنستی جا رہی تھی۔

"جی —— تو یہ سیٹ نمبر ۱۳ کا امکان ہے۔ ابھی تک یہ صاحب تشریف نہیں لائے۔ بس ابھی ٹکٹ بن جائے گا۔ اطمینان رکھیں ؟"

اس نے آہستہ سے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ کیسے الگ الگ سے چہرے تھے۔ اتنے بہت سے ایک سے ایک نہ ملتا تھا۔ ان چہروں کی کثرت پر وہ ایک دم سے حیران رہ گیا۔ اور ہر چہرہ ایک جسم کے ساتھ کیا اطمینان سے چپکا تھا۔ شانوں پر دھرا تھا۔ مطمئن اور ہر ہر چہرے میں دو دو جھروکے تھے کہ جن کے رستے باہر کی تمام کی تمام کائنات اندر آتی جاتی۔ رچتی بستی تھی۔ ان کھڑکیوں کو بند کر دو تو پھر —— ؟ پھر بھی یہ بند کہاں ہوتی ہیں۔ راستے اسی طرح کھلے رہتے ہیں۔ اور دنیا جہان کا شور، ہنگامہ، سیال، واردات‌یں بہی چلی جاتی ہیں، اندر باہر۔ اندر باہر۔

"جی کیا کہا؟ یہ کھڑکیاں کھلتی نہیں جناب —— کھل جائیں تو سب کی سب ٹھنڈک غارت ہو جائے ——"

برابر کی سیٹ پر سے آواز آئی۔ اس نے ذرا گھوم کر دیکھا بہت سے چہروں میں سے ایک چہرہ —— مطمئن اپنے جسم کے شانوں پر دھرا تھا۔

"ہاں یہ بھی عجب معاملہ ہے۔ ٹھنڈک زندہ رکھنا چاہو تو کھڑکیاں دروازے بند کر دو —— کبھی نہ کھولو ——"

مگر میرے محترم یہ ریل تو ایرکنڈیشنڈ ہے۔ اس کے شیشے دیوار کی مانند جامد ہیں۔ کھلتے نہیں۔

"ساتھ والے نے ذرا مسکرا کے کہا" ہاں میاں ٹھیک کہتے ہو مجھے کونسا ہر اسٹیشن سے پکوڑے خریدنا ہیں "۔

"ہاں —— واہ صاب واہ" ساتھ والا ہنس دیا۔

"میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں یہ سب ان کھڑکیوں دروازوں، شگافوں ہی کا چکر نہ ہو —— اب یہ دیکھو کہ ہر چہرے نے اپنے حسابوں ایک کائنات بنا رکھی

ہے۔ اس طرح ہر چہرے کی ایک کائنات ہوئی نا۔ تو اتنی بہت سی دنیا ہیں۔ ان گنت، بے حساب ۔ان فنٹی تک، تو میاں کیوں نہ اس چکر ہی سے چھٹکارا پائیں۔ یعنی کہ کیا معلوم تم کیا دیکھتے ہو اور میں کیا دیکھتا ہوں تو آؤ اپنے اپنے دیکھنے سے باہر آجائیں۔ تب دیکھیں کہ کیا دکھتا ہے۔ واہ حد ہے کہ ایک چہرہ جل بجھا تو ساری کائنات، ان گنت دنیائیں ہی جل بجھیں۔ یا پھر یوں کہ جب بہت ہی تھک جاؤ۔ بری طرح اور ایک اندھی تھکن کا سایہ تمہارے سر پر منڈلاتا رہے تو بس سپرد ہو جاؤ۔ جناب یہ تمام شور و غوغہ فتنہ و فساد یہ انفنٹی بھی ختم۔ تو بھیا یہ سب کچھ خود ہی بناتے بگاڑتے ہو؟ لاحول ولا بڑے شعدہ باز ہو۔ سمجھے!

"السلام علیکم جناب۔ معاف کیجیے گا۔ سو رہے تھے۔

آپ —— ہاں ذرا تکلیف تو ہوگی۔ مجھے یہ اٹیچی کیس رکھنا ہے۔ ایک شخص نے اس کا شانہ ہلایا۔

"ہاں — ہاں۔! اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"واہ —— اتنا سامان؟" ایک اٹیچی کیس کہہ کے اس نے سوٹ کیس۔ ہولڈ آل۔ ٹوکریاں اور بنڈل جانے کیا کچھ رکھنا شروع کر دیا۔

"بہت تیاری کے ساتھ سفر ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ اتنا سامان۔

آخر اس سے نہ رہا گیا۔

"وہ جی بس کیا کیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ایک ایک چیز بھی تو یہ ڈھیر سا سامان اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ میری سیٹ دائیں ہاتھ کو ہے۔" وہ اپنی سیٹ کی طرف مڑ گیا۔

گاڑی چلتی جا رہی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ اس کا ساتھی مزے سے سو رہا تھا۔ خوب گونج دار خراٹوں کے ساتھ۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ گلا صاف کیا۔

"تو جناب یہ میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تعارف نہیں کرائیے گا مجھے

—— کہتے ہیں۔ اس نے کچھ نام بتایا۔ اب اس اچانک حملے پر وہ کچھ پریشان ہوا۔

"ہاں میاں۔ سبھی دیکھے بھالے ہی ہوتے ہیں"۔

"نہیں جی —— یوں تو بات نہیں بنتی۔ شاید اب سے کچھ عرصہ پہلے کہیں اخباروں میں آپ سے ملتی جلتی تصویریں۔ میں اتنی دیر سے یہی سوچ رہا تھا"۔

اب اس کی بات پر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ مگر تھکن کے ساتھ ساتھ اب کے شدید پیاس کی ایک لہر اس کے گلے کے گرد لپٹ گئی۔

"یہاں کہیں پانی وانی کا انتظام بھی تو ہوگا"۔ اس کو گھنٹی کا بٹن یاد آیا مگر بڑھ کر اس کا دبانا ایک مصیبت بالکل محال تھا۔

یہاں ایک دوسرے کا جاننا نہ جاننا برابر ہے۔ دراصل وقت کی یادداشت بہت ہی کم ہے۔ انتہائی کم بلکہ ناقص۔ اب خود مجھ ہی کو یاد نہ تھا۔ مگر یہ بھی اچھا ہی ہے دراصل انسان کی یادداشت بھی کیا کمال کی کتر بیونت کرتی ہے!

"بھئی آج یہ جھٹکے بہت دے رہی ہے گاڑی کیا بات ہے۔ یہ ہیمرنگ اچھی نہیں یار۔ پچھلی دفعہ یوں ہی ہوا کر بھئی اماں تھیں۔ میرے ساتھ —— وہ تو تمام رستہ پڑھتی ہی گئیں۔ یوں گیند کی طرح اچھلتی گئی —— اور پلوں پر تو خاص طور پر"۔ اس کے ساتھ والے نے اگلی سیٹ والے سے کہا۔

"ہاں یار۔ پہلے تو ہوائی جہاز ہی میں ایسی ٹینشن ہوتی تھی۔ اب کم بخت یہ سواری بھی ایسی ہو گئی کہ زمین کے ساتھ ہی نہیں لگتی"۔

"دیہ کچھ زمین ہی دھکے مارتی ہے۔ میرے دوست بہت تھک گئی ہے۔ صدیوں سے کچھ کم بوجھ ہے اس کی چھاتی پر!"

"میاں یہاں کہیں ٹھنڈا پانی ملے گا؟" اس نے برابر والے سے کہا۔ ذرا بٹن تو دبایئے گا۔ اور اس نے اپنی جیب ٹٹولنی شروع کی۔

"جناب رہنے دیجئے۔ اب پانی بھی مول کا ملے گا کیا؟" اس نے گھنٹی بجائی۔

"عجیب بات ہے ـــــ" بہت زیادہ سامان والے نے گھوم کر کہا۔

"ہاں یہی تو مجھے بھی حیرانی ہے۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں شروع سے۔ جب سے چلا ہوں۔

یہ ساتھ والی بھی بھی سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ انتہا ہے۔ اتنا فاصلہ تو دو گاڑیاں برابر ساتھ ساتھ نہیں چلتیں۔"

"ہاں بھئی یہ پٹریوں کا بھی کچھ نہ پوچھو۔ ایک تو باہر گھپ اندھیرا ہے۔ بس یہ ساتھ والی کی کھڑکیوں کی روشنی ہے۔ سو پتہ چلتا ہے۔ یہ تو یوں ہے گویا کوئی مخبر ساتھ کا ساتھ دوڑا چلا جاتا ہو۔"

"جناب پانی!" بیرے نے گلاس آگے بڑھایا۔ اس نے چونک کر گلاس پکڑا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ عجب طرح کا پانی تھا۔ بالکل خشک، اس نے بھڑکتی پیاس کے ساتھ گلاس واپس کر دیا۔

"بھئی شرط لگا لو ـــــ" "اس میں لڑنے کی تو بات ہی نہیں۔" چند سیٹیں چھوڑ کر دو شخص آپس میں بری طرح الجھ رہے تھے۔

اچانک ہی کسی اجنبی سے احساس نے اسے آ دبوچا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ کوئی کھڑا نہ تھا۔ تو پھر واقعی وہ سیٹ نمبر ۱۳ والا نہیں پہنچا۔ تو اب تو مل گئی۔ یہ سیٹ، اس نے ذرا اطمینان سے بیٹھنا چاہا۔ سامنے پرلے سرے پر ایک دوسرا وردی پوش ایک ایک کے پاس رکتا شاید ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔

"ہاں بھئی شرط ہو جائے پھر ـــــ یار عجب گھپلا ہے۔ اے بھائی صاحب ذرا توجہ فرمائیے گا۔"

دونوں الجھنے والوں نے وردی پوش کو پکارا۔

"حاضر ہوا جناب ـــ"

اب وہ اس سے کچھ سیٹیں پرے ـــــ تھا۔ اس نے جیب میں سے بٹوا

ٹٹولا۔ واہ بھئی واہ۔ یہ کہاں گیا۔ پھر اس نے دوسری جیب دیکھی اور پھر تیسری چوتھی ایک تو یہ لباس ہی بے کار تھا کہ جس میں اتنی ساری جیبیں ہوں۔ یاد ہی نہ رہے کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔ اوپر سے انسان کی یادداشت بھی کیا کتر بیونت کرتی ہے ارے واہ۔ اب اس کو کھڑا ہونا پڑا۔ ہپ پاکٹ بھی خالی تھی۔ وہ کچھ تھوڑا سا پریشان ہوا۔ تو پھر کیا گھر پر ہی رہ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ بلا ارادہ سفر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اٹھے اور اٹھ کر چل دیئے۔ خیر۔ اس نے سوچا وہ گھڑی اور انگوٹھی تو ہے ہی —— مگر ہاتھ پر نظر پڑی تو خالی —— آہم اس نے ذرا اپنا گلا صاف کیا اور حیران ہوا کہ اس جیسا ہوش و حواس کا پکا، جہاں دیدہ، بین الاقوامی شخصیت رکھنے والا ایسے چکر میں پھنس گیا۔ اب یہ اس نے ساتھ والے کو نہیں بتانا چاہا تھا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک، ایک مگر لاحول ولا۔ اگر ضرورت پڑی تو اس وردی پوش کو ضرور بتانا پڑے گا۔ اور اسے اسٹیج فلم، ادب کے وہ بہت سے بے چارے نام والے یاد آئے۔ جو میدان چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ پھر پلٹ کر آئے تو کسی نے نہ پہچانا۔ اور وہ ایرے غیرے کو بتاتے پھرے کہ صاحب میں فلاں ہوں۔ اور نام بتا کر بڑا امید نظروں سے ایروں غیروں کی آنکھیں ٹٹولتے رہے اور وہاں خالی خولی آنکھوں میں ان کو اپنا آپ ایسا بھک منگا نظر آیا کہ جوں عمر کی حدیں پھیلا نگتی ترے مارتی، ہیر تریں لاحول ولا —— یہ میں کس چکر میں پھنس گیا۔

اب وردی پوش ان دونوں جھگڑتے شخصوں کی سیٹ تک پہنچ چکا تھا۔

"جی!" اس نے ان کے ٹکٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب یہ سراسر فریب ہے۔ دھوکا ہے نا انصافی ہے۔"

"جناب بات کیا ہے؟" وردی پوش نے کہا۔

"کیا آپ نہیں جانتے؟ اب آپ چھپایئے نہیں آپ سب جانتے ہیں۔" ایک نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ ہماری گاڑی نہیں چل رہی کھڑی ہے۔ جناب جا مدرہے اور دراصل یہ ہماری ساتھ والی گاڑی چلی جارہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہماری چل رہی ہے۔ دھوکے ہم نے بچپن میں بہت کھائے۔ مگراب نہیں۔ جناب، اعلان کردیا ہوتا۔"

"ارے واہ صاحب ۔ ایسی کوئی بات نہیں ذرا صبر سے کام لیجیے۔" صبر سے کام کیا خاک لیں گے۔ صاحب ہماری منزل کھوٹی ہوتی ہے۔ خدا جانے کہاں سار۔ کب سے، کھڑے کھڑے دوپہر سے گھپ رات کرادی۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ چلو یہ تو اچھا ہی ہوا۔ چلی ہی نہیں تو سیٹ اور ٹکٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ چھڑی کا سہارا لے کر اٹھا۔ دروازے کی جانب چلا۔

"جناب کہاں جائیے گا؟ چلتی گاڑی سے!"

"چلتی؟ ___ میاں وہ صاحب فرمارہے ہیں کہ نہیں چل رہی۔ دوسری والی ہے۔ ساتھ والی جو چلتی ہے۔ ہم کھڑے ہیں۔

"بیٹھیے جناب۔ تشریف رکھیے۔ اس کا بھی فیصلہ ہوجائے گا۔ سب کچھ صاف ہوجائے گا۔ جی ہاں ٹکٹ"۔

وہ ایک دم سے اپنی نشست میں گرا۔ ماتھے پر ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ رومال سے پونچھا تو رومال تر___

"وہ دراصل جو ایک پہلے وردی پوش تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ چانس سیٹ ہے۔ ٹکٹ بن جائے گا۔"

"جی ہاں ___ ہے تو چانس سیٹ ہی۔ لیجیے ٹکٹ بنائے دیتے ہیں۔ اس کا ہاتھ خالی جیب پر رک گیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وردی پوش نے ناک پر سے عینک اتاری۔

"میں بھی کہوں۔ یہ چلتی گاڑی میں سے کہاں جاتے ہیں۔ بیٹھیے جناب بیٹھیے۔"

"نہیں میاں تم غلط سمجھے ہو۔ دراصل میں بے ارادہ ہی ___ وہ سب کا

سب گھر میں منیز ہی پہ دھرا رہ گیا۔ انسان کی یاد داشت بھی کیا ناقص ہے .... اور پھر — آہم تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔" اس نے وردی پوش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ مگر سناٹے میں آ گیا۔ وہاں آنکھ کے شیشے میں ایک دوسرا چہرہ۔ بالکل اجنبی۔ چپکا تھا۔

"اجی پہچاننے نہ پہچاننے سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت حقیقت ہے۔ اور اصول اصول۔"

"نہیں میاں۔ یہ بات نہیں۔ دراصل تم کوئی سا میدان لے لو۔ کیا کھیل کیا سائنس۔ دین ہو کہ ادب — اب کیا کچھ کہوں۔ اب میں کوئی ایسا گمنام بھی نہیں۔

"حضور۔ ہم انسانوں کو ناموں سے نہیں ٹکٹوں سے گنتے ہیں۔

اب دیکھیئے ہمارے بھی تو کچھ فرائض ہیں آپ خود ہی بتایئے۔ آپ جیسے لوگوں کا کیا کیا جائے!"

"ہاں ہے" تو سوچنے کی بات۔" اس نے اپنے ہلکے پھلکے، ٹوٹے پھوٹے تختہ سر کو رواں پانیوں میں ہلکورے کھاتے دیکھا۔

"اک ذرا زحمت کیجیئے گا۔" وردی پوش نے بڑھ کر دیوار میں لگے سُرخ ہینڈل کو نیچے کر دیا۔ ایک جھٹکا سا لگا۔

"اجی میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ یہ تو وہ راستہ ہی نہیں بھائی کوئی ایمرجینسی تھی تو پہلے ہی بتا دیا ہوتا — یہ جنگل ویرانے میں کہاں رک گئے؟ ارے، واہ — وہ برابر والی کہاں گئی —!

"بھیا پٹڑی کیوں بدل دی؟"

"آپ سے بھی وضاحت کر دیں گے صاحب۔"

وردی پوش نے اس کو ہاتھ میں چھڑی پکڑائی اور سہارا دے کر اٹھایا۔

چلیئے اس دروازے سے — وہ اس کو دروازے سے باہر لے آیا۔

گھپ اندھیرے میں۔

"اِدھر آئیے ـــــ" اُس نے اشارا کیا۔

مگر سامنے تو کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ صرف لوہے کی اونچی اونچی باڑیں لوکرار۔ اور نیچے ہی نیچے جھکتا منہ کھولتا ـــــ پنجے پھیلاتا ـــــ سیاہ سایہ ایک کونے سے دوسرے تک پھیلتے پروں کی تیرتی سرسراہٹ کے ساتھ نیچے ہی نیچے۔ آگے پیچھے پھیلتا ـــــ

گاڑی کی سیٹی مدہم سی اٹھی پھر ڈوب گئی۔ پاؤں تھے کہ میلوں گہری ریت میں دھنسے جاتے تھے اور کانٹوں بھری پیاس ایک زنجیر سی اس کے گلے کے گرد لپٹتی چلی گئی ـــــ

"چینی کا پیالہ"

رات بھر پانی جی بھر کے برسا تھا۔ بوندوں کا ایک طوفان دروازوں، کھڑکیوں کے شیشوں سے سر مارتا رہا تھا اور وہ گرجنے والا اس کی خوبیاں پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا۔ کہ اچانک خاموشی ہو گئی اور بھیگی تاریک ہوائیں تھم گئیں کہ جیسے کوئی رو دھو کر چپ ہو جائے۔ خود ہی۔ آپ ہی کہ کوئی اس کو چپ نہ کرائے اور وہ خود ہی میلی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو خشک کرنے اور ان کی نمک زدہ خاک رخساروں اور ہونٹوں کے گوشوں سے چپک جائے۔ اور وہ خود ہی چپ ہو جائے۔

چنانچہ جب اس نے باہر نکل کے دیکھا تو سامنے میدان میں اور اس کے پیچھے پھیلی پہاڑیوں پر، اور ان کے درمیان لیٹے راستوں پر مٹی کا رنگ کچھ کچھ سبز ہو رہا تھا۔ پس اب پھر وہ مردہ زمین اور کھیتیاں اور پہاڑ اور راستے جی اٹھنے کو تھے اور ہولے ہولے سبز سانس بھرتے تھے۔ اور وہ پاؤں میں رلنے والے سوکھے تنکے اپنی جڑوں کے ساتھ زمین میں کھڑے ہو گئے تھے۔ اور سال ہا سال پرانی خوشبوئیں پھر ویران چیکے لگاتی تھیں۔ اور کوئی کوئی دن، کوئی کوئی لمحہ مر دہ وقت کی کھیتی میں سے اڑتا اڑتا (نا) تھا اور کہتا تھا۔ دیکھو میں آیا ہوں۔ مگر وہ منہ پھیرتی تھی اور اس کو پہچاننے سے انکار کرتی تھی۔ وہ مکس تھا یا زنگوں بھری تتلی کہ گھوں گھوں کانوں کے گرد گھومتا تھا۔ آنکھوں سے ٹکراتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنا قدیم تھا کہ تھکا دیتا تھا۔ رلا دیتا تھا۔ اس لیے اس نے ٹیرس کا دروازہ دھاڑ سے بند کیا اور نیچے اتر آئی۔

رات کسی نے میز پر سے برتن نہ اٹھائے تھے اور وہ اسی طرح منہ کھولے پڑے تھے۔ اس نے انہیں سمیٹنے کی خاطر تلے اوپر رکھا۔ اور اس کی نظر اس شکر دان پر پڑی۔ تو پھر یہ موسم آگیا۔ اس نے دیکھا شکر دان چیونٹیوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اور اس کا رنگ یوں بدلا تھا کہ اس کی سفیدی تمام کی تمام گہرے بھورے رنگ میں چھپ گئی تھی۔ اور وہ گہرا بھورا رنگ اتنا ساکت تھا کہ شکر دان سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے حیرت سے آگے بڑھتا ہاتھ روک لیا۔

"اوں ہوں"۔ اماں نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"اوں ہوں"۔ وہ اماں کے ہنکاروں کا مطلب بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ کوئی انتہائی غلط کام کر رہی ہے۔ چنانچہ رک گئی اور کھڑی رہی۔ اماں نے کھٹ پٹ غصے کے عالم میں جائے نماز تخت پر رکھی اور ہواؤں اور چاروں کونوں اور سینے پر دم کر کے عجلت سے بولیں۔ "ارے بھئی اب اس کو لے کر کب تک کھڑی رہو گی۔ باہر روشنی میں لے جاؤ۔ وہاں کیاریوں کے پاس۔ ذرا دھوپ ہو گی تو خود ہی نکل جائینگی سب کی سب۔ اتنی بھی عقل مت نہیں"۔

اس نے آہستہ سے شکر دان اٹھایا اور باہر چلی آئی۔ ابھی روشنی تھی۔ دھوپ نہ تھی۔ اس نے وہ پیالہ زمین پر رکھ دیا۔ اور اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور بیٹھی رہی۔

وہ گلیاں بھی کیسی تکونی۔ سرخ سرخ۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنی تھیں۔ کہ جن پر وہ اکڑوں بیٹھ کر گٹے کھیلتی تھی۔ کھیلتی تھی اور ہمیشہ ہارتی تھی۔ پتھر کے وہ گھس گھس کر ملائم ہو جانے والے اور رنگ بدل لینے والے گٹے کسی طور اس کے ہاتھ ہی میں نہ آتے تھے۔ اور وہ حیران ہوتی تھی کہ کس طرح وہ پروین، اختری اور زہری کے پھرتیلے، مضبوط ہاتھوں میں دبک جایا کرتے۔ اور گیند تو مانو ان کے ہاتھوں سے جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ ایک ڈوری سے بندھی اوپر نیچے اچھلتی رہتی۔ اور اکثر کھیل کے بعد وہ چور آنکھوں سے ان کے ہاتھوں اور پھر گیند کی طرف دیکھتی مگر وہاں تو کوئی ڈوری

نہ تھی۔ اور وہ اپنے ہاتھوں کی نااہلی پر اداس ہو جاتی اور گھر کے دروازے کے باہر سیڑھی پر بیٹھ جاتی۔ جب کہ وہ تینوں اسی طرح گلی میں اکڑوں بیٹھی گیٹے اچھالتی رہتیں۔ اور وہ پتھر ان کے حکم پر اچھلتے اور گرتے اور سب کچھ انکی گرفت میں ہوتا۔

"پہلا تھال ـــ ہسپتال ـــ" پروین کو عادت تھی ہمیشہ ایسی ہراساں کرنے والی بات کرنے کی۔ وہ اسپتال کے نام سے ڈر جاتی اور حیران ہوتی کہ گیند اور گیٹوں میں اسپتال کا ذکر کہاں سے آجاتا ہے۔ مگر پروین کے ساتھ ساتھ وہ تھال گھمائے چلی جاتی۔ اور اس کے بعد دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور اس کے قدرے لمبے اور چوڑے دانت اس کے پتلے پتلے ہونٹوں اندر شام کے پھیلتے اندھیرے میں چمکتے اور اس کی ضرورت سے بڑی آنکھیں۔ سیاہ کالی آنکھیں اور بھی پھیلی پھیلی نظر آتیں۔

"بس بھئی بس۔" ایک دم سے اختری پروین کا ہاتھ پکڑ لیتی۔

"بس۔ بوا جی کہتی ہیں شام پڑتے کھیل نہیں کھیلتے۔" اور پھر وہ تینوں سروں پر دوپٹے اوڑھ لیتیں۔ اور بھول جاتیں کہ وہ ان کی پشت پر گھر کے دروازے کے باہر دوسری سیڑھی پر تنہا بیٹھی ان کو دیکھتی ہے اور اس کے پاس کوئی دوپٹہ نہیں کہ جس سے وہ سر ڈھانپے اور ان میں شامل ہو جائے۔

مغرب کی اذان دھندلی زرد بتیوں اور پالش اڑے دروازوں اور کھڑکیوں کے رنگین شیشوں اور اونچے چوباروں کی خاموش ممٹیوں اور پروین کی سیاہ پھیلی آنکھیں ایسے روشندانوں سے ٹکرا ٹکرا کر سارے میں پھیلتی جاتی اور وہ تینوں اس سے پرے۔ الگ۔ کچھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں پڑھتیں۔ پڑھتیں اور جانتیں کہ وہ تینوں ایک ہی چیز پڑھ رہی ہیں اور اس عمل میں باہم شریک ہیں۔ اور ایک ہیں۔ مگر وہ پیچھے اس سیڑھی پر بیٹھی ان کو دیکھتی کہ ان کو معلوم نہیں وہ یہ سب کچھ پڑھنا نہیں جانتی۔ چاہتی کہ ان سے کہے کہ اونچا بولو۔ مجھے بھی بتاؤ کہ میں بھی پڑھوں اور تمہارے ساتھ حفاظت کے اس حصار میں چلی آؤں۔ اور خوف کی نرم نرم ہوائیں چاروں

سمت اس کے گرد بہنے لگتیں اور وہ اتر کر ان کے قریب آ جاتی۔ اذان ختم ہو چکتی۔

"چلو آؤ بجھارتیں ڈالیں۔" اختری کہتی اور سب کی سب اب گلی چھوڑ کر دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں۔

"پہلے تم ڈالو" زہری شاید اس کا اکیلا پن محسوس کر لیتی اور اس کو اپنوں میں شامل کرنے کو کہتی۔ مگر اسے تو بس وہی ایک پہلی ہی آتی تھی۔ جو ہونٹوں سے نکلنے سے پہلے ہی لوگ پکڑ لیتے۔

"مجھے تو نہیں آتی۔" وہ اس گھسی پٹی بجھارت سے بچنے کی خاطر کہہ دیتی "ہا۔ بچاری۔ اس کو تو کوئی کھیل بھی نہیں آتا۔" اختری ترس کھاتی "نئیں۔ یہ بات نئیں۔ اس کا انگریزی اسکول ہے نا۔ واں بجھارتیں نئیں ہوتیں۔ مجھے بھابھی جی نے بتایا ہے۔"

زہری نا معلوم کیوں ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی تھی۔ جب شہتوت کے درخت پر چڑھتی تو نیچے کھڑے سب لوگوں میں سے پہلے اسی کو پکارتی۔

"جھولی کر۔ جھولی۔ توت کھائے گی نا۔" وہ فوراً اپنے فراک کا چھوٹا سا دامن پھیلا دیتی۔ اور زہری پکے پکے شہتوت۔ سیاہ، بھرے بھرے، ٹپ ٹپ۔ اس جھولی میں گرائے جاتی اور جب تک وہ خود بس نہ کہتی وہ اپنے منہ میں ایک دانہ بھی نہ ڈالتی۔

"اچھا بس کر اور —" اور پھر وہ اونچی اونچی ٹہنیوں میں کھڑی — دونوں ہاتھ چھوڑ کر — بازو لمبے لمبے کر کے خوب خوب شہتوت توڑ توڑ کے کھاتی۔ اور ساتھ میں گائے جاتی۔ جھنڈا اسلام کا لہلہاتا رہے۔ اور گاتے گاتے رک جاتی۔ پھر ایک دم سے اونچے اونچے تنے سے چھلانگ مار دیتی۔

"تم بھی اسکول میں گاتی ہو نا۔ جھنڈا اسلام کا۔" وہ اپنے دوپٹے کا جھنڈا بنا کر لہراتی۔

"نئیں —" وہ بے حد شرمندہ ہو جاتی — "ہم تو وہ گاتے ہیں۔ ون فٹ اپ اینڈ فٹ ڈاؤن —"

"چلو چلو — کوئی بات نہیں۔ وہ بھی اچھا ہے۔" وہ دوپٹہ کس کے کمر کے

گرد باندھ لیتی۔

"چلو لکن میٹی!" وہ نعرہ لگاتی۔ اور پھر سب کی سب گلی کے دروازوں اور کھمبوں اور پیڑوں کے پیچھے چھپنے لگتیں۔ اور کسی دیوار کے کونے سے لگے، اس کا دل دھڑک دھڑک کے گلے میں آجاتا اور کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگتیں۔ وہ کس کو ڈھونڈیگی؟ اور عین توقع کے مطابق وہ سب کو ان دیکھی آنکھوں سے دیکھتی۔ بالآخر اس کو آن پکڑتی۔

"چھو!"

وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک دم اُچھل جاتی۔ اور پھر وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ساری گلی میں بھاگتی پھرتیں۔ اب وہ دونوں ہوتیں ایک ساتھ — اور باقی سب الگ ہو جاتیں۔ زہری کا ہاتھ مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے ہوتا اور اس کا یہ ہاتھ سخت ہوتا۔ کھردرا، محنتی۔ جس کی ایک انگلی میں پیتل کا چھلا چھپتا اور اس کے چپکے چپکے بالوں اور چیکٹ پراندے میں سے سرسوں کے تیل کی بو آتی اور ہنستی تو سفید دانتوں کے گرداگرد دنداسے کا گہرا بھورا رنگ پھیلا ہوتا۔ بالکل اس شکردان کی طرح۔

پھر وہ سب کی سب سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں کہ اس وقت شام گذر چکی اور اب رات کی صدائیں گلی میں اُڑتی پھرتیں۔ لوگ دروازے کھڑکھڑاتے۔ سائیکلیں اور چارپائیاں اندر کرتے۔ کوئی کھڑکی کھلتی کوئی بند ہوتی اور انہیں معلوم ہوتا کہ ابھی ان کا نام پکارا جائے گا اور سب کو اس گلی کو چھوڑ کر اٹھ جانا ہوگا۔ ایک ہی پکار پر، چپ چاپ، سر جھکائے، بغیر کسی حجت کے کہ یہ نام کا پکارا جانا اٹل ہے۔

"بجھارتیں ڈالو۔"

زہری پھر سب سے کہتی اور یہ شام کا آخری کھیل ہوتا اور سب کے جسم تھکن سے اور دل اداسی سے بوجھل ہوتے اور ایک لمبی رات سامنے پڑی ہوتی۔

"اُڑتا ننگاں — پار ٹنگاں —" اختری ایسی بوجھل پہیلی کہتی کہ اس کی آواز دل

میں وہ بھٹک بھٹک کر سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی اور اس کی بوجھ وہ دونوں باقی کی لمحے بھر میں یک زبان بتا دیتیں۔ جو اس کی سمجھ میں کبھی نہ آتی کہ اس نے کبھی کنواں نہ دیکھا تھا پانی سے بھرا، شاداب، نیچا گہرا کنواں، نہ خالی سوکھا کنواں اور نہ ہی وہ کو بجیں۔

تب زہری وہ آخری بھارت ڈالتی کہ جس کے بعد اور کوئی بھارت نہ آتی کہ دراصل اس کے بعد کوئی بجھارت تھی ہی نہیں جو آتی۔ وہ گویا اس بجھارت کی سیاہ چادر ایک جھٹکے کے ساتھ تمام زمین و آسمان پر ڈال دیتی اور خود ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سیڑھی پر، ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی رہتی۔

چینی کا پیالہ ٹوٹ گیا کوئی جوڑن والا نئیں
سرکاروں جندرے ورج گئے کوئی کھولن والا نئیں

اس کا سر ایک دم خالی خولی اِدھر اُدھر گھومنے لگتا اور اداسی کی ابکائی اس کے گلے میں آن پھنستی اور گلی میں چلنے والے اکا دکا لوگ۔ اور منڈیروں پر منڈلاتی بھٹکتی آوازیں۔ سب ساکت ہو جاتیں۔ رک جاتیں۔ ٹھہر جاتیں۔ اک سیاہ چادر تلے۔ پھر گھر کی کھڑکی سے آواز بھاری پتھر کی طرح ان کے قدموں میں آن گرتی۔

"زہری او زہری"۔ اور تمام در و دیوار پکارتے۔ "زہری او زہری" "چلو۔ چلو"۔ اس پکار پہ وہ سب کی سب لبیک کہتیں۔ اور پروین اور اختری اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتیں۔ زہری وہ تنگ زینہ چڑھنے لگتی اور اس کے پیچھے — قدم قدم وہ — یہاں تک کہ زرد بتی کی روشنی سے بھرے صحن میں وہ جا پہنچتیں اور وہاں سامنے چولہے کے پاس برتنوں کا ڈھیر اور راکھ بھرا پیالہ زہری کے منتظر ہوتے۔ اور بڑی اماں اور بڑے ابا اس بڑے اونچے موٹے موٹے رنگین پایوں والے پلنگ پہ بیٹھے ہوتے۔ بڑی اماں کے ہاتھ میں خلال ہوتا اور بڑے ابا لوہی کی بکل مارے حقے کی نے منہ میں گڑگڑاتے۔ کھسر۔ کھسر۔ زہری کے محنتی ہاتھ پتیلیوں پر راکھ گھستے اور وہ اسی خوف میں رہتی کہ ابھی اس کا وہ پیتل کا چھلا پتیلی کے ساتھ رگڑ کھا جائے گا۔ اور وہ جسم میں سرسراتی ہوئی والی آواز آئے گی۔ اسی انتظار میں وہ

بڑے ابا کی بغل میں دبے دبے سو جاتی۔

تو جب اس کے باپ سے پوچھا گیا تو اس نے حسبِ دستور ماتھے پر ایک موٹی سی تیوری ڈالی اور سر کو جھٹکا اور حقہ اٹھا کر باہر چل دیا۔ ''مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا یہ کیا کہے گا۔ اس نے کبھی آج تک اولاد کو اولاد سمجھا ہو تو جب نا'' بڑی اماں نے بھنا کے کہا۔ ''بس کرو جی ہاں۔ بن ماں کی ہے۔ میں کب تک اس کی دیکھ بھال کروں گی۔''

اور گرمیوں کی انہی چھٹیوں میں زہری نے گٹے کھیلنے سے ہاتھ اٹھا لیا اور شہتوت کے درختوں پر چڑھنا بند کیا۔ کیونکہ اس کی شادی لمبوترے چہرے اور بھورے بالوں والے ایک شخص سے ہو رہی تھی کہ اس کی گردن پتلی سی اور لمبی تھی اور جب وہ بولتا تھا تو اس کی آواز بمشکل گلے سے کھلتی تھی اور گردن کی رگیں پھول پھول کر پھٹنے کو آتی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں باہر کو ابل پڑتی تھیں۔

زہری بہت خوب صورت ہو گئی تھی اور اماں کے ساتھ لگی رات دن کپڑوں پر گوٹا اور ستارے ٹانکتی تھی۔ پھر ایک دن تین چار تانگوں میں بیٹھے کچھ لوگ آئے۔ اور سرخ کپڑے پہنے زہری خود اپنے پاؤں چلتی ان کے ساتھ رخصت ہو گئی اور بڑی اماں اور اماں دونوں نے سکھ کا سانس لیا کہ وہ اس کی ذمہ داری سے آزاد ہوئیں۔ چھٹ گئیں۔ اب ان کا کیا واسطہ اس سے۔ اور اس کے باپ کا بھی اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور اس کی ماں کا بھی اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ وہ مٹی تلے دبی غافل سوتی تھی۔

پھر عرصے بعد جب اب کے وہ آئی تو ایک ان دیکھی آڑ ان دونوں کے درمیان تھی۔ اس نے اس کو دور سے دیکھا اور نہ پہچان پائی کہ یہ وہی زہری ہے جو گٹے کھیلتی تھی اور درختوں پر سے شہتوت گراتی تھی۔ اور اچانک اس کو آن پکڑتی تھی۔ وہ چپ چپ تھی۔ سیانی ہو گئی تھی۔ اور اماں کے ساتھ زیادہ باتیں کرتی تھی۔ اور ان دیکھی آنکھوں سے اسکی جانب دیکھتی تھی۔ اور کچھ کچھ دیر بعد آنسو اس کی

آنکھوں سے اُبل اُبل کر رخساروں پر بہہ نکلتے تھے۔

"بی بی۔ اب تمہارا وہی گھر ہے۔ شاباش دل چھوٹا نہیں کرتے۔" اماں نے گھر۔ گھر مشین چلاتے ہوئے کہا اور زہری نے حسرت سے اس گھر کے در و دیوار پر نظر کی۔ پھر اپنے دوپٹے کو سہلانے لگی۔ مگر اس کی آنکھوں کے آنسو نہ چھپے۔ اور وہ اس کے آنسو دیکھ کر فوراً دروازے کے پیچھے چھپ گئی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ اس نے یہ آنسو دیکھے۔ کم از کم زہری نہ جانے کہ کبھی وہ ان آنسوؤں کی شہادت میں نہ پکڑی جائے۔

دوسرے کمرے میں وہ لمبوترے چہرے اور بھورے بالوں والا شخص بیٹھا تھا۔ اور اس کے ساتھ تین چار اور بھی اور بڑے ابا کے درمیان بیٹھے تھے۔ اور سب بڑھ چڑھ کے بول رہے تھے۔ تب بڑے ابا نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور وہ دروازے کے باہر کھڑی اندر کی اونچی اونچی گرجتی برستی آوازیں سنتی رہی۔

مگر اماں نے زہری کو وہ سیاہ ریشمی برقع پہنا دیا۔" اور دوسرے کمرے سے اس کا آدمی آیا اور بولا۔" چل بھئی چل۔" پھر ذرا رکا اور بولا۔

"اور کیا کیا بتاؤں بھابی جی۔ ایک تو میں اس کے پاس بیٹھتا ہوں تو جیسے اس کو گولی لگتی ہے۔" اس نے گلے کی رگیں پھیلائیں۔

"نانا۔ اے زہری۔ پتہ ہے فرشتے لعنت کرتے ہیں تمام رات۔"

یہ بھی فرشتوں کی کتنی زیادتی تھی کہ زہری ہی کو لعنت کرتے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آئی۔ اور زہری ایک معتوب و ملعون چیز، سیاہ برقعے میں لپٹی چلی گئی۔ چلی گئی اور کچھ عرصے بعد اس کے گھر کی طرف سے ایک چھوٹا سا لڑکا دوڑا آیا۔ اور اماں سے بولا۔ "زہری بیمار ہے بہت۔ آپ کو یاد کرتی ہے۔ جاؤ اس سے مل آؤ۔" اور اس کے باپ نے ایک موٹی سی شکن ماتھے پر ڈالی اور حقہ بغل میں داب گھر سے نکل گیا۔ اور اس نے شہتوت کے درختوں اور گلی کے کھمبوں سے کہا۔ زہری بیمار ہے بہت۔ تم کو یاد کرتی ہے۔ مگر سب خاموش کھڑے رہے۔ ساکت اور اس نے پاؤں میں رلتے پتھروں سے کہا۔ زہری بیمار ہے بہت۔ تم کو اماں نے اس کے باپ سے کہا۔ زہری بیمار ہے تم کو یاد کرتی ہے۔ مگر سب پڑے منہ لٹکا کر

پھر کئی مرتبہ ہوائیں اور ان ہواؤں کی خوشبوئیں اور رنگ بدلے اور کئی مرتبہ "دالان" میں لحاف بچھے۔ ان کے ڈورے ادھیڑے گئے۔ اور پھر ان میں دھنی ہوئی بادلوں کی سی روئی ڈال ڈال کر ڈورے ڈالے گئے۔ اور اماں چھڑی مار مار کے روئی کو لحافوں میں برابر برابر کرتیں رہیں۔ اب وہ محض کنارے پر بیٹھ کر منہ نہ دیکھتی بلکہ اماں ایک بڑی نوکدار سوئی اس کے ہاتھ میں بھی تھما دیتیں۔ اور ٹانکا چھوٹا اور سیدھا رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے اسکو بھی کام میں لگا دیتیں۔ اور سب کے سب بھول چکے تھے کہ زہری کہاں اور کیسی ہے۔

تب ایک، ایسی ہی رات ایسے ہی پانی جی توڑ کے برسا تھا۔ اور دروازوں کے شیشوں اور کھڑکیوں ساتھ سر پٹکتا تھا۔ وہ گرجنے والا اس کی خوبیاں پڑھتا تھا کہ پھر یکدم سناٹا ہو گیا۔ بھیگی تاریک ہوائیں تھم گئیں۔ جیسے کوئی رو دھو کے خود ہی چپ ہو جائے خود ہی چپ ہو جائے کہ کوئی اس کو چپ نہ کرائے اور وہ میلی ہتھیلیوں ساتھ آنسو خشک کر کے خود ہی چپ ہو جائے۔

چنانچہ بھیگی بھیگی دھوپ چڑھے پھر ایک عورت زہری کے گھر کی جانب سے دوڑی چلی آئی اور سر کا برقع اتارے بغیر بولی۔

"بہت بیمار ہے زہراں۔ بد نصیب نے کسی کے کہنے پر کھانسی بخار روکنے کو مٹی کا تیل پی لیا ہے۔ اور اب خون الٹ رہی ہے۔ خون — کڑاہیاں بھر گئی ہیں بی بی جی —"

وہ دروازے کے پیچھے کھڑی سنتی تھی۔ اور اس نے چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے کہ انصاف کے دن ان کو شہادت میں پکڑا جائے۔ مگر اس کی انگلیاں اپنی جگہ پر پتھر بنی ساکت رہ گئیں۔

" اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اس کے باپ کو پکارا جو باہر گیٹ پر زمین پر اکڑوں بیٹھا حقہ گڑگڑاتا تھا۔

"ماما— او— ماما"

مگر وہ حقہ بغل میں داب اٹھ کر چل دیا۔ اور اماں ایک اور آہ بھر کے پھر چاول چھننے لگیں۔ اور شام ڈھلے معتوب و ملعون زہری کی جانب سے آخری ہرکارہ آیا کہ جو اس نے خود نہیں بھیجوایا تھا۔

"او بیوقوف! تو کیا ریسرچ کر رہی ہے" اچانک امتیاز ہاتھ میں ریکٹ لہراتا آیا۔ وہ چلیبی کے پیالے کے قریب اکڑوں بیٹھی تھی۔ بیٹھی تھی مگر اب کھڑی ہو گئی۔

"اس طرح جائیں گی یہ۔۔۔؟" امتیاز نے جھک کر کہا۔ اور پھر پاؤں سے دھیرے سے ٹھوکر ماری پیالے کو۔

"ناشتہ کا وقت ہو گیا ہے۔ دیر کرائے گی سب کو۔"

ٹھوکر پر وہ رزق سے چپکی مخلوق، حقیر، معتوب مخلوق ایک بھگدڑ میں پڑ گئی۔ وہ اپنی کائنات کے کناروں کناروں تک بھاگ اٹھی۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکراتی، ایک دوسرے کو روندتی، کہ چاہتی تھی کہ اس کائنات کے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے کہ ان تمام امکانات سے نکل کر کسی اور حصار میں جا بسے۔

— کہ آج کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا رہا تھا۔

"او ایڈیٹ۔ اس پیالے کو کھڑکھڑا— زور سے— یوں—" امتیاز بری طرح جھلا رہا تھا۔

"اس طرح—" اس نے پیالہ اٹھا کر زمین کے ساتھ کھڑکھڑایا۔

اور وہ کھڑکھڑانے والی— تم کیا جانتے ہو وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟ وہ بلند کو پست اور پست کو بلند کر ڈالنے والی— کوٹ ڈالنے والی— وہ معتوب اور امتحان میں ڈالی گئی مخلوق اندھا دھند بھاگ رہی تھی اور اس پیالے کے کناروں سے نکل جانے کی دھن میں تھی۔ کہ پیالے میں دراڑ پڑ گئی۔ ایک۔ دو۔ نہیں بہت سی اور وہ الگ الگ ٹکڑوں میں بکھر گیا۔ مٹی بن گیا— اور مٹی تنہا رہ گئی۔ وہ مخلوق جا چکی تھی۔ کہیں اس کا نام و نشان نہ تھا اور نقش پا بھی نہیں، نہ ہی کوئی اس کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔

"پرندہ"

ہاں! میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ زینے پر۔ پوری گیارہ سیڑھیاں۔ پھر دروازے کی ہلکی سی آہٹ۔ اور وہ قدم۔ نرم رواں بادلوں کے سے تیرتے قدم۔ اِدھر اس دہلیز سے اندر ہوں گے۔ اور اس کمرے کا وجود بدل جائے گا۔ میں بدل جاؤں گا۔ ایک اَن دیکھا مفہوم اس کمرے میں، میرے، اس کے، ہر چیز کے گرداگرد تن جائے گا۔ وہ آہستگی سے اپنے سرد ہاتھ سے میری کلائی تھامے گی۔ اس کی بے وزن انگلیاں میری نبض ٹٹولیں گی اور گھڑی کی ٹِک ٹِک چاروں سمت فضا بن کر بہنے لگے گی۔

"گُڈ" وہ سرہانے رکھے چارٹ پر جھک جائے گی۔

"رات نیند کیسی آئی؟" وہ کرسی میرے قریب کھسکا لے گی۔

تب مجھے وہ تمام باتیں بھولی بسری۔ دُور افتادہ، اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں پڑی، خاک اَٹی یاد آجائیں گی۔ ایک دم سے، ایک ساتھ ایک ہی ساعت میں اور میں اُسے بتاؤں گا دیکھو یہ جو ایک سیدھی لکیر کا تسلسل ہمارے تمہارے ذہنوں میں ہے۔ سب فریب ہے۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہیں بھی کوئی پہلے یا بعد، شروع اور آخر۔ آگے اور پیچھے نہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہے۔ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل رہی ہیں۔ ایک محلول ہے، میرے سامنے، میری زبان پر یا شاید میری آنکھوں میں۔ بے رنگ، بے ذائقہ محلول۔ جس طرح بے کار، بے ذائقہ

زبان۔ اور یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وجود ہے۔ اور یہ سب کچھ میں اس سے نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ اسی ایک نرم مُسکراہٹ کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ مگر عین کہتے کہتے میرے سب الفاظ گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ اس کمرے کے بعد۔ آگے قطار میں اور بھی کمرے ہیں اور سب میں ایک ایک میں، ہاں ایک ایک میں اسی طرح بستر پر، کسی ایک ساعت کا منتظر۔ اس سے خائف، اس سے پناہ لئے پڑا ہے اور کیا معلوم میں ان میں سے کونسا ہوں۔ چنانچہ میں اس سے صرف اسی قدر پوچھتا ہوں۔

"کیا تم کو بھی ایک ساعت۔ ایک پیچھے پیچھے لپکنے والی ساعت کا انتظار ہے اور تم اس سے خائف ہو۔ ایک تجسس کے ساتھ۔؟"

ہاں ہم سب اس کے منتظر ہیں۔ اس سے خائف ہیں اور متجسس"۔

"مگر تم ابھی۔ تمہیں مجھ پر کتنی ہی فوقیتیں حاصل ہیں"!

"تم نے پھر بھاری بھاری لفظ بولے۔ دیکھو میں یہ فوقیتیں وغیرہ نہیں سمجھتی۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ لفظ —— خالی لفظ نہایت مبتذل چیز ہیں"۔

"مبتذل؟ تو کیا تم بھی ——"

"ہاں —— تم عجیب آدمی ہو —— نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ تمام باتیں کہہ دیتی ہوں جو میں کبھی کسی قیمت پر کسی اور سے نہ کہوں —— لفظوں میں سوچنا —— محسوس کرنا نہایت مبتذل حرکت ہے"۔

"تو پھر کس طرح سوچا اور محسوس کیا جائے"۔ میں آپس میں محلول ہوتی ساعتوں میں بہہ گیا۔ ایک بے ذائقہ، بے رنگ احساس میری زبان پر تھا۔ اور یہی سب پر محیط تھا۔

"یہی تو مصیبت ہے۔ اسی لئے میں نے لکھنا چھوڑ دیا"۔ اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خود فریبی پر ہنسی آگئی۔ اور پہلی بار میں نے نہایت اعتماد کے ساتھ محسوس کیا کہ میں ہر طرح سے اس

سے کہیں بہتر ہوں۔ اس پر فوقیت رکھتا ہوں۔

"شاید اس لئے کہ تم ہی لکھ نہ سکتی تھیں۔ تم اچھی رائٹر نہ تھیں۔ لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب چھوٹے ہوتے ہیں۔ بناوٹی"

"ہاں شاید ـــ یہ بھی درست ہو ـــ میں نے کب کہا کہ میں لکھنے والی ہوں"۔ اس کی آنکھوں میں غصّے کا سایہ لہرایا۔ لکھنے والا تو کوئی کوئی ہی ہوتا ہے۔ ہاں یوں تو بہت سے لکھتے ہیں ـــ لکھتے رہیں گے ـــ دراصل میں نے تو یہ جانا تھا ایک دم ـــ ایک عجیب خاموشی، پرسکون دوپہر میں ـــ اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی کہیں بھی نریشن نہیں"

"نریشن؟"

"ہاں! کہیں بھی نریشن نہیں ـــ یہاں لفظ ہیں۔ اور عمل اور وقت ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ ناقص لفظ۔ اور ادھورا عمل تو یہ نریشن تو دراصل ہم خود بناتے ہیں۔ عمل کو لفظوں میں لکھنے کے مجرم ہم خود ہیں۔ اس لئے کہ وہ تسلسل جو ہم پیدا کرتے ہیں۔ وہ منطق جو اس میں لا ڈالتے ہیں اس کے جھوٹ سچ کو نہیں جانتے۔ محض ایک مفروضہ کی بنا پر لکھ ڈالتے ہیں۔ لہٰذا یہ غلط ہے"

"مگر جب ہم لکھیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور"

"اور سوچ۔ سوچ بغیر عمل کے نہایت متبذل ہے"

"تو پھر ہم کیا کریں؟"

"عمل ـــ" صرف عمل ـــ اور لکھنا اور سوچنا تو صرف نبیوں اور ردیلوں کا حصہ ہے"

"تم مجھے حیران کرتی ہو ـــ سخت حیران" میں نے کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو ـــ لیٹے رہو ـــ" اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ

رکھ کے مجھے لٹا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ تو میں منتظر ہوں۔ وہ سب بھی منتظر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے اس کو مجھ پر کتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ کوئی گننا چاہے تو نہ گن سکے۔

"دیکھو —— یہ سب انتہائی غلط ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔"

—— تو کیا میرے تمہارے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ ان باقی تمام کے ساتھ بھی ہے —— تو تم اس طرح علامت سی بن جاتی ہو اور یہ سب نہایت غلط بات ہے۔ بہرحال میں تو تمہیں بتانے والا تھا کہ میں وہاں پھر گیا تھا

—— تم وہاں گئے تھے؟" وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکی

—— میں وہاں گیا تھا۔ مگر تم کب یقین کرتی ہو —" شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزردگی تھی۔

"نہیں —— نہیں —— اگر تم چاہو گے تو میں یقین کروں گی۔ تم وہاں گئے تھے؟"

ہاں —— میں وہاں پھر گیا تھا۔ آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ سڑک تپ رہی تھی۔ میرا سر یوں تھا جیسے کیتلی میں پانی اُبلتا ہو۔ پیاس کے مارے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ وہاں کی سڑکیں بالکل ویسی ہی ہیں۔ وہ کناروں کناروں سے، جہاں جہاں سے گلیوں کی اینٹیں اکھڑی تھیں اسی طرح تھیں۔ گھروں کی کھڑکیوں پر رنگین چقیں اسی طرح گری تھیں۔ وہ کونے والا مائی جنت کا مکان ہے اس کا بوریئے کا پردہ تو میں ہٹاتا تھا اور حد ہے اس نے اب تک اس کا سوراخ مرمّت نہیں کیا تھا۔ نالیوں میں خربوزے کے بیج آموں کے چھلکے پڑے تھے۔ تو جب میں اسکول والی گلی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا لکڑی کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ حالانکہ ان گلیوں میں بھیڑ بکریوں کا گھس آنا تو ایک عام سی بات ہے

پھر بھی ان لوگوں نے دروازہ کھلا رکھا تھا ـــ تو میں بغیر دستک دیئے اندر چلا گیا۔ اندر نہایت اندھیرا تھا اور ٹھنڈک۔ میں ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں پہنچا تو بڑی اچھی پر سکون روشنی تھی۔ آنکھوں کو آرام دینے والی۔ سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ اور حقے کی نے اس کے منہ میں تھی مجھے دیکھ کر ماں نے کہا۔ ''بڑی سخت لو چل رہی ہے۔ تم کہاں گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہو۔ چلو نمکین لسی کا گلاس پیو۔

وہاں میز پر جگ رکھا ہے''۔ میں میز کی طرف بڑھا تو ماں نے پیچھے سے کہا۔

''اور یہ کیا تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے ان سب کا سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔ پانی کی ناپاکی کی مصیبت الگ۔ تمہارے ابا بھی سخت ناراض ہو رہے تھے''۔ میں نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیوں ـــ کیوں ناراض ہو رہے تھے؟''

''بھئی کیا عذاب ڈال رکھا ہے''۔ اس نے چھت کی طرف اشارا کر کے کہا۔ تب میں نے دیکھا برآمدے کی چھت میں جو بڑا کنڈا پنکھے کی خاطر لگا تھا اس میں رنگین ڈوری کے ساتھ لٹک رہا تھا ـــ ایک پنجرہ۔

''اس میں کیا ہے؟'' میں گلاس چھوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر اس پنجرہ پر کپڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہٹانا چاہا تو ماں چلائی۔

''رہنے دو ـــ یہ کپڑا نہیں ہٹاؤ۔ بیمار ہے بیچارہ ـــ ڈر جائے گا ـــ مر جائے گا''۔ نفرت کی سیاہ لہر میرے پیٹ میں اٹھی۔

''تو پھر ادھر کیوں رکھا ہے اسے؟'' میں دھاڑا۔ اس پر ماں بولی۔ ''میں کیا جانوں۔ تمہیں تو لے کر آئے تھے۔ رکھ گئے بغیر کچھ کہے سنے''۔

''میں ـــ؟ ہاں تو کیا حرج ہے ـــ ہاں ـــ میں نے ہی رکھا ہے ـــ پھر ـــ؟'' میں غصہ میں باہر آگیا۔ ''کیا تم جانتی ہو وہ پنجرہ وہاں کیوں

ہے ؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"نہیں — میں نہیں جانتی۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ مکان، وہ گلیاں — آج سے بیس برس پہلے کارپوریشن والوں ڈھادی تھیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں ؟"
"نہیں، نہیں — میں نہیں جانتا — مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔
"ہاں — تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں چلوں۔ وقت ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد — فوراً بعد میں نے اگلے روز اس کے آنے کی ساعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر سیال بنیں میری آنکھوں کانوں، پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہہ نکلی تھیں۔ اور وہ یہ کہہ گئی تھی کہ لفظوں میں سوچنا اور سوچ کے متعلق سوچنا کے نہایت مبتذل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں — ہم دونوں ابتذال سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا — راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے، سب جانتی ہے کہ وہ میرے برآمدے کی چھت سے لٹکتا پنجرہ وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھ آیا تھا؟ ماں کہتی ہے — اور وہ اس پر لیٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے جانوروں سے ڈرتے ہیں — شاید اسی لئے — مگر ماں کہتی ہے وہ بیمار ہے۔ وہ پردہ ہٹا تو ڈر جائے گا۔ مر جائیگا۔ تو کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے آنے کی ساعت، جو ایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اور میں اس کے سایہ میں تھا۔ اب اس دیوار نور کے میرے قریب آنے میں آوازوں، لفظوں اور ادھوری حرکتوں کے رینگتے سرسراتے ٹکڑے حائل ہیں۔
اس کے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہو بیٹھا۔ میرا رواں رواں سماعت

بن گیا۔ اور گھڑی کی ٹک ٹک کا سمندر چاروں سمت بہنے لگا۔
"گڑے" اس نے آہستہ سے کرسی آگے کھسکائی "رات نیند کیسی آئی؟"
"سنو روز تم مجھ سے پوچھتی ہو —— آج تم بتاؤ —— رات تمہیں نیند کیسی آئی؟"
وہ کچھ ٹھٹھکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔
"نیند —— ؟ نیند دراصل بہت ہی ذاتی قسم کی —— بے حد ذاتی قسم کی چیز ہے اور میں اس کا حجاب نہایت ضروری سمجھتی ہوں"
"تم مجھے حیران کرتی ہو"۔ میں نے پھر کہا۔ "جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموش معاہدہ ہے —— سب کچھ کہنے سُننے کا —— پھر تم ——"
"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو —— مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ نیند سے پہلے کے چند لمحے وہ ہیں جب ہم بالکل تنہا اور نہتے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ارد گرد کے تمام حصار ٹوٹ چکے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے —— وہ تم جانتے ہو —— ؟"
"ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں —— ؟"
"ہاں یہ خوف کہ یہ نہتہ لمحہ اگر کبھی ختم نہ ہوا تو —— اگر یہی ہمارے حصّے کا تمام وقت بن گیا تو —— ؟"
"ہاں —— تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم کو مجھ پر اتنی فوقیتیں حاصل ہیں تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم خود کہتی ہو یہ متبذل ہے۔
"یہ سوچ نہیں —— اس کے لفظ نہیں —— یہ تو احساس ہے۔ محض احساس —— دن کے اُجالے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں کھو دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ لمحہ ختم ہوا۔ مگر یہ سب غلط ہے۔ رات، نیند اور فنا ہم پر تنہا آتی ہے۔ تم نے سُنا —— تنہا"
"ہاں —— میں نے سنا —— میں نے سن لیا۔ مگر میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ تنہا نہ ہو —— کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے؟"

میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا ۔۔۔ مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ سے ذرا سے دباؤ سے مجھے لِٹا دیا۔
"لیٹے رہو ۔۔۔ یہ میں نہیں جانتی ۔۔" اس نے فوراً مجھ سے نگاہ چرائی۔ اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔
"تمہیں معلوم ہے۔ یہ خزاں کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی تیخ ۔ تیز ہوائیں چلتی ہیں خشک بالکل خشک ۔۔۔ اور درختوں سے خشک پتے مسلسل، ہر لمحہ۔ ہر آن گرتے چلے جارہے ہیں۔ صبح وشام ۔۔ اور کبھی کبھی اچانک بے حد مصروفیت میں رک جاتی ہوں ۔۔۔ یکدم مجھے خیال آتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ میرا آخری دِن ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس آخری دن کو دیکھتی ہوں اسکی اترتی دھوپ کو اور چُپ دیواروں کو۔ اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔ یہ کیسا لگتا ہے۔ اور شاید ہر کوئی کبھی۔ کسی وقت اچانک رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دِن ہے۔ مگر میں بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے۔"
"نہیں ۔۔ نہیں ۔۔ ہمیں ضرور بات کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم بہت سی باتیں جب نہ کی جائیں تو ٹھوس واقعے بن جاتی ہیں اور پھر ان کو ختم کرنا ان سے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے اُسے روکنے کی نہایت کمزور سی کوشش کی۔ وہ گھڑی دیکھ رہی تھی۔
"تم وقت کی اتنی پابند ہو ۔۔ کیوں اتنی پابند ہو۔ تم ایک لمحہ پہلے آتی ہو نہ بعد میں دو پل رک جانے کو کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"
"کیوں ۔۔۔ یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ دراصل مجھے گھر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے بچے گھر آتے ہیں جب میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے، میں خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر کچھ ہی دیر میں وہ لڑھکتے موتیوں کی طرح مجھ سے الگ دور ہو جاتے ہیں اور عمل رک جاتا ہے۔ وقت رواں رہتا ہے، لفظ یلغار کرتے ہیں اور یہ سب انتہائی بے سود ہے۔"

"ہاں — تم ٹھیک کہتی ہو — مگر —"

"اچھا — دوا کھانا نہیں بھولنا — اور سر اور بخار کھو ادھ۔ تکیہ پر —"

وہ بادلوں کے سے تیرتے قدموں سے چلی گئی۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔ اوہ خدا — اس کے جاتے ہی یہ مجھے اتنا کچھ یاد کیوں آجاتا ہے۔ مجھے تو اس سے پوچھنا تھا اس پنجرہ کے متعلق اور اس کے اندر رہنے والے کے بارے میں۔ پھر یہ سب کچھ کل پر ملتوی ہو گیا۔ لیکن نیند سے پہلے کا ایک یہ ننھا لمحہ اگر طویل ہو گیا۔ محلول ہو گیا اور ساعتوں میں تو سب کا رنگ بدل جائے گا — ذائقہ بدل جائے گا — اور ہم سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔

مگر اچانک مجھے برابر والے کمرے سے پلنگ اور کرسیاں گھسٹنے کی آواز آئی۔ — پھر بوجھ گھسٹتے، بمشکل سیڑھیاں اترتے ناہموار قدموں کا ہجوم — اور سب کچھ تھم گیا تو یہ واقعی کسی کا، ساتھ والے کا آخری دن تھا۔ یہ کیسا تھا؟ میں نے کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑانے کی کوشش کی — وہاں کہیں کہیں اکا دکا تتے اڑ رہے تھے اور بس — تو یہ دن بھی اور دنوں کا سا تھا۔ اور پھر ایک دم مجھے ہنسی آ گئی۔ تو ایک بار پھر — ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا — میں نہیں تھا۔ میرے پیٹ میں ایک تاریک ننھی ہنسی تل تل کرتی تھی۔ اچھا وہ کل سب سے پہلے مجھے یہی خبر دے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔ وہ اسی طرح ایک خوشگوار واہمے کی صورت وارد ہوئی میری نبض گنی اور چارٹ پر جھک گئی۔ اس کی جھکی آنکھیں دیکھ مجھے گذری رات کی بھولی بسری ساعتیں یوں یاد آئیں جیسے صدیوں پہلے کی بات — اتنی جلد ان پہ خاک اٹ گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا —

"کیا بات ہے؟" اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کونسا رشتہ ہے۔ مگر وہ اسی طرح جھکی چارٹ پر لکھتی رہی شاید وہ بھی اس رشتہ کا تعین کرنا

نہ چاہتی تھی۔ اور مجھے ایک دم غصہ آگیا۔ گرم لہو میری کنپٹیوں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔ میرا سر بھاپ بن کر اڑ گیا۔

"میری نبض نہ گنو ــــ میرا بلڈ پریشر نوٹ نہ کرو ــــ اس کاغذ کو چاک کر دو"

میں نے گویا زہر گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نہ بھی آؤ تو کیا ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے مجھے بتاؤ اور تمہارا کیا کیا فرض ہے ــــ میں نے ــــ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے"۔ میں نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔ میری مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔

"سکون ــــ سکون ــــ لیٹ جاؤ"۔ اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

"نہیں ــــ تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے"۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی میں بیٹھ گئی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

"سنو ــــ اگر سن سکتی ہو تو سنو ــــ میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں ــــ جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی اباجی ناراض ہو کر، بول بول کر، باہر نکلے ہوں ــــ ماں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آرہی ــــ کوئی ہل جل نہیں"۔

"کس میں سے؟" میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں لپک کر اٹھا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

"نہیں نہیں ــــ رہنے دو۔ بیمار ہے بیچارا۔ ڈر جائے گا۔ مر جائے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی دیکھے گی"۔

"وہ کون ـــــ ؟" میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارا کیا ـــ میں نے دیکھا تو وہاں تم کھڑی تھیں اور تم کہتی ہو کہ وہاں کبھی نہیں گئیں"۔

"میں کھڑی تھی ؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

"ہاں تم ـــــ اور پھر جانتی ہو سب سے بڑا ہنستا لمحہ وہ تھا۔ جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم چپکے سے آئیں۔

پنجرہ کا غلاف اٹھایا ـــ پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی "اوں ہوں" تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اٹھایا۔

اوں ہوں ـــ سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے ـــ" تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اُسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا ـــ اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی ـــ میں آگے لپکا کہ دیکھوں ـــ اسے دیکھوں ـــ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آدبایا کہ کہیں یہ اس ہنستے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رک گیا۔

چلا آیا ـــ چلا آیا بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں"۔

نہیں ـــ نہیں ـــ مجھے نہیں دکھاؤ ـــ" اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ "مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے ـــ ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے ۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں وہ اسی کمرے کی تھیں تمہارے کی نہ تھیں ؟

پیار کہانی

وہ آدھی رات ہی رہی ہوگی کہ جب اس کے ریشمیں ہاتھوں کا لمس میری پیشانی پر شیریں سیال نشہ بن کر بہنے لگا۔ میں گہری نیند سے بمشکل بیدار ہوا۔ چند لمحے اس شیریں لمس کے سحر کو پیشانی کے راستے تمام جسم میں سن سن اترتے محسوس کرتا رہا۔ پھر کہیں ڈوب جانے، کھو جانے، نہ ہونے کے خوف سے ہولا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔

ہاں وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کے چاندنی ایسے ہاتھ —— نرم، گداز —— میری پیشانی کو دھیرے دھیرے سہلاتے تھے اور اس کے جسم کی گرم خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ میری کنپٹیاں دھڑ دھڑ جل اٹھیں اور آنکھوں میں بخار سا چڑھ آیا۔

"اُٹھو!" اس نے جادو بھری آواز میں سرگوشی کی۔ یوں کہ پھر میرا سر چکرا گیا۔

"اُٹھو!" اس نے چہرہ میرے قریب جھکاتے ہوئے کہا۔

"یاد ہے اپنا وعدہ؟" میں نے بیڈ لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھا جو خوبصورت نہیں تھا مگر آدھی رات کے سحر میں وہ تمام دنیا —— پورے امکانات کو سمیٹتا ہوا نظر آتا تھا ۔ اور میں اس آدھی رات کے سحر سے بہت خائف تھا۔ اس کا اندیشہ ہر دم میرے خون میں دھڑکتا رہتا۔ یہ خوف کہ ابھی آدھی رات آئے گی اور وہ مجھے یوں جگا کر پوچھے گی: "اپنا وعدہ یاد ہے؟" وعدہ جو میں نے

کبھی اس سے نہ کیا تھا ـــــ جو اس نے خود ہی تصور کر لیا تھا اور اس کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ اور جب بھی میں اس کے وجود کے سیال نشے میں بہہ جانے کو ہوتا، وہ مجھ سے پوچھتی ـــــ اُسی وعدے کے متعلق۔

"اُٹھو تو پھر چلیں!" وہ اپنی گوری گداز باہیں میری طرف پھیلاتی۔

"دیکھو ـــــ تم نہیں جانتیں"۔ میں تقریباً ٹوٹتے ہوئے، ریزہ ریزہ بکھرتے ہوئے کہتا۔ وہ خاموش میرے پاس آن بیٹھتی ـــــ اس کی میٹھی گرم خوشبو میں میں نیم بے ہوش سا ہو جاتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہتی۔

"تم جانتے ہو؟ ـــــ تمہیں یاد ہے؟ ـــــ سب سے پہلے جب ہم ملے تھے تو تم نے کہا تھا ـــــ "ہاں میں تمہارے ساتھ چلوں گا"۔ کہا تھا نا؟

ـــــ دیکھو بس اب تو تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اب میں تمہیں پریشان نہ کرونگی۔ سچ کہتی ہوں، مجھے راستہ اچھی طرح معلوم ہے"۔

"لیکن! ـــــ یہاں ہم کتنے امن سے، خوشی اور چین سے ہیں، یہ تو سوچو ـــــ اور جب بھی میں بہت خوش ہوتا ہوں اور جانتا ہوں کہ تم بس میرے لئے ہو، تم اٹھ کر چل دیتی ہو۔ میں اس روز روز کی مسافری سے تنگ آگیا ہوں۔ خدا کے لئے کچھ تو سوچو۔ تمہیں میرا سکھ چین نہیں بھاتا کیا؟"

اس پر وہ ایک دم چونک جاتی۔ اس کی چمکتی آنکھیں آنسوؤں سے اور بھی چمک اُٹھتیں۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟" وہ میرا سر نرمی سے اپنی گود میں رکھ لیتی۔ اُس کے جسم کی خوشبو بھری آنچ میرے حواس معطل کرنے لگتی۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا! ـــــ کیا میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں بتایا کہ تم تو اس دنیا کے ساتھ میرا ناطہ ہو، ورنہ میں ریزہ ریزہ اُڑتی پھروں ـــــ جس طرح زمین کی کشش ختم ہو جائے یا جسم کا وزن مر جائے ـــــ تو تم میرے وجود کا وزن ہو ـــــ اور صرف اسی لئے میں تمہارے ساتھ یہ سفر کر رہی ہوں"۔

"سنو، میری بات سنو — تمہیں کچھ پتہ دتہ تو ہے نہیں — جانا کہاں ہے؟ کدھر سے جانا ہے؟ — اور آج کل راستے ایسے خطرناک ہیں، جگہ جگہ سڑکیں ٹوٹی ہیں۔ پُل ناقابلِ اعتبار — نہ کوئی جگہ کا نام پتہ دیتی ہو — میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا —"

"دیکھو! — مجھے سب معلوم ہے۔ اب کے میں تمہیں بالکل نہیں ستاؤں گی۔ بس سیدھی سڑک ہے۔ بائیں ہاتھ پر جب آبادی شروع ہو جائے تو ذرا آدھا میل آگے چل کر ایک بستی ہے۔ وہی ہے بس — بالکل — اب اُٹھو۔"

یہ آدھی رات کا سفر میری سمجھ میں ذرا بھی نہ آیا۔ مگر میں تو جیسے کسی مقناطیس سے کھنچا چلا جاتا تھا۔ مجھے اپنے وہ سب دوست احباب بہت یاد آئے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے عورت کے جادو سے بچنے کی تنبیہ کیا کرتے تھے۔ اشاروں کنایوں سے سمجھاتے تھے کہ میاں! عورت کے سامنے ذرا دل مضبوط اور ہوش و حواس قائم رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن میں با قائمی ہوش و حواس اس کے ساتھ ساتھ ہو لیتا تھا، کیونکہ اس کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آنے پر بھی دل کو بھاتی تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میرے ان بھلا چاہنے والوں نے نہ تو اُس کا وہ جادو بھرا لہجہ سنا تھا، نہ میٹھے خوشبو اُڑاتے بول — جب وہ اپنی خوب صورت باہیں میری جانب بڑھاتی تو جی چاہتا دنیا کا ہر ان ہونا کام اس کی خاطر کر گزروں۔ یہ ان جانا، بے منزلا سفر تو کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔

اور اب کے تو واقعی اس کے بتائے ہوئے تمام نشانات بھی درست ہی نکلے۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی تو کوئی بات نہیں۔ گاڑی کون سی نئی تھی کہ اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا خطرہ ہوتا۔ ہاں یہ خدشہ تھا کہ کہیں راستے میں رُک رُکا گئی تو ایک مصیبت ہوگی۔ جب بھی کہیں گہرا کھڈا آتا تو وہ ایک دھچکے کے ساتھ تقریباً میری گود میں آن گرتی — میرا جی چاہتا ڈرائیونگ بند کر دوں، رک جاؤں مگر پھر وہ مسکرا کے، سنبھل کے ہو بیٹھتی۔ آج اس کی آنکھوں میں عجب سرور بھری محویت تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی کے

باوجود اس کی پیشانی اور ہونٹوں کے اوپر پسینے کی نمی آجاتی۔ اور وہ رومال سے چہرہ پونچھے جاتی۔

"وہ دیکھو! ــــ وہ دائیں ہاتھ! اُس پہاڑی پر وہ جھونپڑی ہے نا؟ اور اس میں روشنی بھی ہے ــــ یہ تو پکی نشانی ہے۔" اس نے عجب سی سرخوشی کے عالم میں کہا۔

"ہاں بھئی، ہے تو سہی ــــ مگر ابھی آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لو یہ سگریٹ سلگاؤ۔"

اُس نے سگریٹ سلگا کر میرے ہونٹوں میں دبا دیا۔ ہوا خاصی خنک ہو چلی تھی۔

"سردی ہے بھئی!" میں نے جھرجھری لی تو اس نے اپنی نازک سی جھلملاتی سفید شال میرے کاندھوں پر ڈال دی اور کچھ دیر میرے شانے کے ساتھ سر لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے لمس میں، ایک عجب طرح کی الوداعی کیفیت تھی۔ میں نے جُھک کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"کیوں بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں" وہ ایک دم مسکرا دی۔ "میں سوچ رہی تھی، تم میرے وجود کا وزن ــــ ہو، اس دنیا کے ساتھ میرا ناطہ ــــ اسی لئے جب میں پرزہ پرزہ ہونے لگتی ہوں تو تمہیں چھوتی ہوں، تم سے چمٹ جاتی ہوں۔ مگر ــــ مگر آخر تو مجھے پرزہ پرزہ ہونا ہی ہے۔" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"کچھ ضروری نہیں محترمہ!" میں نے ہنسی میں بات ٹالنا چاہی۔

"ہاں بہت ضروری ہے۔ دراصل تو یہ سب کچھ اسی عمل کی تیاری ہے۔ ہر کام، ہر بات، ہر فعل۔ کیونکہ ہر شخص خود اپنے سامنے جواب دہ ہے ــــ اور جو ہے سو ہے، اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ ہے سو ہے۔ لہٰذا تمام امکانات تمام ہو جاتے ہیں، ہر شئے اٹل ہے۔"

"اب تم زیادہ ہی بہکتی جا رہی ہو۔ لو سگریٹ سلگاؤ۔"

"وہ دیکھو! وہ کچی آبادی آگئی ہے نا — ذرا آگے جا کر دائیں ہاتھ کو وہ دروازہ ہے۔" وہ سنبھل کر ہو بیٹھی۔

"واہ بھئی! — اب کے تو تم نے کمال ہی کر دیا۔" اس نے اپنے یخ ہاتھوں میں میرا ہاتھ پیار سے سہلایا — ایک جھرجھری میرے تمام جسم میں دوڑ گئی — دبی دبی سی دہشت آمیز جھرجھری۔

"مگر تم مجھے یہاں لائی کیوں ہو؟" میں جیسے ایک دم ہوش میں آگیا۔

"میں صرف تمہیں نہیں لائی، ہم دونوں آئے ہیں۔ اگر تم نہ آتے تو میں کب آسکتی تھی — میں تو تمہارے طفیل یہاں تک پہنچی ہوں۔"

"عجب، بے معنی بات ہے بھئی — یہ تم مجھے لفظوں کے چکر میں نہ الجھایا کرو۔ میں تو سیدھا سا آدمی ہوں۔"

"لفظوں سے آزاد ہونے کو تو یہاں تک آنا پڑا ہے!" ایک اُداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔

"وہ دیکھو دروازہ! — بس ادھر رک جاؤ۔"

میں نے گاڑی روک دی اور سر سیٹ کے ساتھ لگا کر ذرا آنکھیں بند کر لیں۔

"کھٹ کھٹ!" وہ شاید لوہے کا زنگ خوردہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی، جس کے دونوں طرف سے اونچی اونچی پکی، فصیل نما ایک چار دیواری شروع ہوئی تھی۔ اور پیچھے کہیں اندھیرے میں بوسیدہ سی اونچی عمارت تھی۔ میں نے تھکن کے مارے غور سے دیکھا بھی نہیں۔ چرر چرر — دروازہ اپنے قدیم قبضوں پر گھوم کر ذرا سا کھلا — پھر اس کے اور کسی اور کے بولنے کی آواز آئی۔

"ہاں! — یہ رہا میرا شناختی کارڈ — میں ٹھیک وقت پر ہی پہنچی ہوں۔ وہ — وہ میرا ساتھی ہے۔ یہ اس کا کارڈ دیکھو۔"

تھوڑی دیر میں دروازہ آدھا کھول دیا گیا۔ وہ تھکے قدموں میری طرف آئی۔

"اب آگے پیدل کا راستہ ہے، گاڑی بند کر دو۔ اس طرف کے شیشے میں چڑھاتی ہوں۔"

گاڑی اچھی طرح بند کر کے میں اس کے ساتھ ساتھ اس ادھ کھلے دروازے کے اندر داخل ہوا۔

کچھ تھوڑا سا ویران، خاک اڑتا میدان چھوڑ کر سامنے بوسیدہ سی عمارت کھڑی تھی۔ کچھ لوگ نہایت مشغول، خاموشی سے ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ گویا کسی بڑے کام کی تیاری میں مصروف ہوں۔ قریب جانے پر ایک دروازے پر "دفتر" لکھا نظر آیا۔

"میں ابھی آئی!" وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہو گئی۔

اب مجھے تھکن کے مارے نیند آ رہی تھی۔ ابھی صبح ہونے میں خاصی دیر تھی۔ عمارت کے باہر دو کھمبوں پر زرد زرد بلب جل رہے تھے۔ میں اس کے انتظار میں ایک درخت کے ساتھ سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک ہی وہ سب لوگ جو ادھر ادھر چلتے پھرتے مصروف نظر آتے تھے، سامنے ایک جگہ پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا انبوہ ہو گیا۔ میں بھی ذرا قریب سے دیکھنے کی خاطر آگے چل دیا۔ دیکھا تو سامنے ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے کہ سبھی لوگ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے کھڑے تھے۔ پھر سب کے سروں کو دائیں جانب جنبش ہوئی۔

ہاں! میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ —— وہی تھی! جو چپ چاپ نظریں جھکائے چبوترے کی طرف آ رہی تھی۔

تب میری نظر چبوترے پر گڑے لوہے کے اس چوکھٹے اور اس کے ساتھ لٹکے موٹے رسے کے پھندے پر پڑی۔

"نہیں! —" چیخ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مگر وہ چبوترے پر پہنچ چکی تھی۔ دونوں طرف سے دو آدمیوں نے اس کو تختے پر لا کھڑا کیا — "نہیں نہیں،"

— میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
"مگر کیوں؟ کیوں؟ —" میرے حلق سے زخمی کراہ نکلی اور میں اندھا دھند ہجوم کو چیرتا آگے بڑھا — بڑھتا گیا۔ وہ جو ایک چھوٹا سا ہجوم تھا نہ معلوم کیسے جنگلوں سے زیادہ گھنا ہوتا گیا۔ میں باہوں سے راستہ چیرتا آگے بڑھتا گیا — مگر کب تک؟ معلوم نہیں اس چبوترے تک کتنے برسوں کا سفر تھا۔ جب میں وہاں اس کے قریب پہنچا تو تمام تماشائی جا چکے تھے۔ میں نے اس کے سرد جسم کو باہوں پر اُٹھالیا۔ اس کے لمبے لمبے بال کھل کر میرے بازوؤں سے نیچے تک گر رہے تھے۔ میں نے اس کے زرد، نیلے پڑتے چہرے کی جانب نگاہ کی، اُن دھندلی اَدھ کھلی آنکھوں کی جانب جو ستارہ سی دمکا کرتی تھیں مگر اب ایک میلا دھند میں لپٹا شیشہ تھیں۔
"یہ تم کہاں آگئی تھیں؟" میں؟ — نہیں۔ نہ معلوم کون میری کن پٹیوں میں دھڑکتے لہو اور آنکھوں کی جلن اور شہ رگ کے رواں لاوے میں دھک دھک پوچھتا تھا، بولتا تھا — "یہ تم کہاں آگئی تھیں؟" تب ایک دم خون میری رگوں میں جم گیا۔ میری نظر اس کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی — وہ ہل رہے تھے، کچھ کہتے تھے۔ میرے پتھر ہوئے سر میں اتنی سکت کہاں کہ میں جھکتا اور اس کے چہرے سے قریب تر ہو جاتا اور سنتا کہ وہ متحرک لب کیا کیا کہتے ہیں۔ میرے ہاتھ، پاؤں، بازو، سب میرا ساتھ چھوڑ گئے — دہشت زدہ میں نے اُسے وہیں چبوترے پر لٹا دیا اور چاروں سمت نظر دوڑائی۔ وہاں تو کوئی نہ تھا جس کو میں پکارتا اور پوچھتا کہ اے لوگو! بولو یہ زندوں میں ہے یا نہیں — کیا میں اُسے اٹھالوں؟
مگر لق و دق ویرانے میں میں تنہا تھا۔ اور میری پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسی لئے ان ہلتے ہونٹوں کو اسی طرح متحرک چھوڑ کر میں چلا آیا — چلا آیا اور اب تک حیران ہوں۔ سوچتا ہوں وہ زندوں میں ہے یا نہیں؟ کیا مجھے اُسے اٹھا لانا چاہیئے۔؟

بایاں ہاتھ

جناب والا: میں سچ کہوں گی۔ بالکل سچ۔ پورا سچ اور کچھ نہیں مگر سچ، گو کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی میں نہیں جانتی کہ سچ کیا ہے۔ یہ تو ایک ایسی شبیہہ ہے جو کوئی ایک دیکھے تو سیاہ۔ بالکل سیاہ نظر آتی ہے۔ کوئی دوسرا دیکھے تو روشن۔ چمکتی دھوپ ایسی روشن، تو کیا یہ کوئی آنکھ کا نقص ہے۔ دونوں میں سے کون آشوبِ چشم کا شکار ہے۔ بہر حال یہ تو بالکل غیر متعلق سی بات بیچ میں آن پڑی تھی۔

میں تو بات اس لمحے سے شروع کرنا چاہوں گی۔ جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا۔ وہ دن بڑا تباہی کا دن تھا۔ صد حیف اس دن پر کہ جب میں نے ایک دم جانا کہ دنیا سے رنگوں۔ خوشبوؤں اور آوازوں کا تنوع مر گیا۔ ہر چیز کا ذائقہ ایک سا ثقیل تہہ میں زبان پر جمنے لگا۔ اور تمام لمس ایک سے لمس ہو گئے۔ بس ایک مٹیالا۔ زرد نیند میں ڈوبا دن ہر چیز پر محیط ہو گیا۔ میں نے جو چیز منہ میں ڈالی ایک مٹیالا ذائقہ چھوڑ گئی۔ چیزوں کے رنگ ان مٹی بھری ساعتوں میں ڈوب گئے اور اپنے پیاروں کے لمس دور دراز کے لاتعلق سابقے بن گئے۔

کچھ دن تو میرے کنبے کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور برداشت کرتے رہے، پھر سب کو میرے چہرے کی لاتعلقی اور آنکھوں کے خالی پن سے کوفت ہونے لگی۔ میرے زوج نے تنگ آکر کہا۔ مجھے لگتا ہے میں کسی پتھر کے ساتھ عمر قید کاٹ رہا ہوں۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ کیونکہ ایک عرصے

سے مجھے اپنا آپ سڑک کے کنارے کھڑے، گرد میں اَٹے حرف مٹے سنگِ میل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ شاں شاں شاں قریب سے تیز رفتار۔ گاڑیاں گرد اڑاتی چلی جا رہی تھیں اور اب ہر طرف صرف شاں شاں کی مسلسل دبی ہوئی کبھی اُبھرتی ہوئی گونج تھی۔ شاید یہ سب باتیں آپ کو نہایت غیر ضروری اور لاتعلق نظر آئیں۔ خود مجھ کو بھی ایسی ہی نظر آتی ہیں۔ مگر پھر آخر آنکھ کو کچھ تو دیکھنا۔ کان کو کچھ تو سننا ہے اگر یہ نہیں تو اس کے علاوہ بھی اور جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔ شاید اب میں آپ کو الجھا رہی ہوں۔ میں اس تمہید کو ختم کر کے اب اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔

جناب والا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ دن بڑا خرابی کا دن تھا۔ جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا۔ کچھ روز تو میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ میں نے اپنے آپ کو خوب خوب کوسا کہ اے بنتِ حوّا لعنت ہے تجھ پر جو تو نے اپنے آپ کو یوں نفس کے حوالے کر دیا۔ ہاں یہ نفس کے حوالے کرنا نہیں تو اور کیا ہے کہ انسان ہوتے ہوئے کوئی اپنے حواس کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہو۔ جی لبھانے والے رنگ دیکھے نہ میٹھی سریلی صدائیں اس کے کان میں پڑیں۔ انواع و اقسام کے ذائقوں کے لئے اس کی زبان مرجائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ پر سو بار لعنت کی اور میں بہت روئی بہت گڑگڑائی اپنے خالق کے حضور کہ بس اب ایک مہیب اندیشہ منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا تھا۔ وہ اندیشہ ایک عجب اٹل ساعت کا تھا۔ نہ ٹلنے والی ساعت۔

میں نے بہت چاہا کہ میں ایک بار پھر وہی وجود بن جاؤں جو در اصل میں تھی۔ وہ جو دیکھنے والوں کو بہت بھاتا تھا۔ جو لطف خوشبوؤں اور رنگوں کی شبیہہ تھی۔ اور رُوح پرور موسیقی کی لہر تھی لیکن ایسا نہ ہوا میں نے سب سے ان سب سے جو میری ذات کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے تھے۔ کہا دیکھو سائیں سائیں کرتا ایک مہیب آسیب منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا ہے۔ اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو تم کیا کرو گے؟ اور پھر مجھے اپنی اس بات پر خود ہی ہنسی بھی آگئی۔ در اصل کہنا تو مجھے یہ تھا کہ اگر اس

آسیب نے مجھے نگل لیا تو میں کیا کروں گی؟ آخر دوسروں کیلئے اس آنے والی واردات کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ اور پھر کونسا تعلق ایسا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو میں اپنے خالق کے حضور بہت روئی۔ گڑگڑائی کہ مجھے اس آنکھ کے عذاب سے پناہ میں رکھ کہ یہ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اسے نہیں دیکھنا چاہیئے اور مجھے خود میری اپنی ذات سے پناہ میں رکھ کہ یہ بڑی سفاک ہے۔ جب اپنی جان پر ظلم کرنے پر آتی ہے تو ٹلتی نہیں۔ مگر جنابِ والا اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت بھی دراصل یہ رونا۔ گڑگڑانا کچھ عجب تھا کہ اندر سے جیسے گہرے خالی کنوئیں میں سے کوئی برابر کہا چلا جاتا تھا۔ کہ ایسا نہ ہو تو اچھا۔ اسی طرح ٹھیک ہے۔ ایک تاریک تجسس۔ پنجے کھولے مجھے جکڑتے کو پل پل بڑھ رہا تھا۔

جنابِ والا آپ ان باتوں سے یہ اندازہ لگائیے کہ میں ان دنوں نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی تھی۔ جی نہیں ابھی مجھ میں اتنی روحانی منافقت تھی کہ میں تمام دنیاوی معمولات کو پورا کر سکوں۔ اور دیکھنے والوں کو محض اتنا سا احساس ہوتا تھا کہ اس عورت کا چہرہ ایک دم سپاٹ اور خالی ہے۔ اور اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی ہے۔

بس یہ انہی دنوں کا ذکر ہے جب میں اپنے شہر کے اس بڑے اسٹور کے قریب سے گزری۔ ان دنوں اکیلے اکیلے سڑکوں پر پھرنا کچھ میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ میں اس اسٹور کے باہر کھڑی ہو گئی اور اس کے بڑے بڑے شو کیسوں میں جھانکنے لگی۔ کچھ لمحے میں نے تمام چیزیں ایک لاتعلقی سے دیکھیں۔ وہی لاتعلقی جو ایک عرصہ سے مجھ پر چھا رہی تھی۔ مگر پھر وہ عجیب واقعہ ہوا۔

جنابِ والا مجھے یوں لگا۔ جیسے کسی نے بجلی کا تیز جھٹکا مجھے لگایا ہو۔ سن سے بجلی کی تھرتھراہٹ سر سے لے کر میرے پاؤں کے ناخنوں تک پھیل گئی۔ پھر یکدم ایک عجیب طرح کی میٹھی آسودگی میرے تمام جسم میں بھر گئی اور مجھے اپنے گرد رنگ ہی رنگ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں سُر ہی سُر پھیلے نظر آئے۔ اتنی خوبصورت دنیا تو میں نے کبھی بھولے بسرے بچپن میں دیکھی ہو گی۔ جب کبھی میں ماں کا ہاتھ تھامے کھلونے بھرے بازار سے گزرتی

تھی۔ اب مجھے حیرت تھی کہ دنیا ایک دم اتنی خوبصورت اتنی رنگین کیونکر ہو گئی۔ شوکیس
میں بھی خوبصورت، بوتلوں اور ان پر لگے رنگا رنگ لیبل، حسن موسیقی کی ایک دنیا آباد تھی۔
وہ دنیا جو میرے لئے مر چکی تھی۔ یہ دنیا خریدی تو جا سکتی تھی مگر اس کے بھاؤ تاؤ میں
اس کے سراب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں مسحور نظروں سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مجھے وہ
سات رنگا شیشہ یاد آگیا جو کبھی بچپن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر
روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھتی تھی۔ کس قدر خوبصورت چمکتے، شفاف اور
شگفتہ رنگ نکلتے تھے۔ اس میں سے جی چاہتا تھا ان کو انگلیوں سے چھو کر دیکھو۔ مٹھیوں میں
قید کر لو۔ وہ رنگ اکیلے اس سات رنگے شیشے میں سے نہ نکلتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ
ایک خوشبوؤں، سُروں اور محبت بھرے لمحوں کی لہریں تھیں کہ گرد اگرد بہنے لگتی تھیں
اور جاتے جاتے ایک نیم بے ہوش اداسی دل کو دے جاتی تھیں تو آج وہ سب
رنگ و بو حسن و موسیقی کی دنیا اس شوکیس میں، اس سات رنگ شیشے میں بند تھی۔ میں
نے شوکیس کے شیشے کے ساتھ ناک چپکا دی تھی۔ اتنی بہت سی خوبصورت چیزیں۔ گویا
ایک جنتِ گم گشتہ تھی اور اس جنتِ گم گشتہ کو پالینے کا ایک جنون میٹھی میٹھی لہریں بن
کر میرے دل و دماغ کو جکڑتا گیا۔ میں ایک دھڑکتے لطیف جال میں لپٹ گئی جس سے نکلنا
اس خوبصورت دنیا کی موت تھی۔ دنیا جو برسوں بعد مجھے نظر آئی تھی وہ ایک عجیب شوق
انگیز لہر تھی کہ مجھے مست بناتی چلی گئی۔

"بیگم صاحبہ۔ اندر تشریف لے آیئے"۔ اسٹور کے دروازے پر سے سیلز مین
نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چونکی۔ کوئی انجانا فیصلہ ابہام کی حدود کو کاٹنے والی کیچ
میرے ذہن میں داخل ہو گئی۔ میں مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جناب والا! میرا بیگ اس وقت بھی نقدی سے بوجھل تھا۔ مگر وہ آسیب
منہ کھولے چلا آ رہا تھا۔ وہ اٹل ساعت آچکی تھی اور میں اس کے گھیرے میں تھی۔ میں
نے بہت سی چیزیں نکلوا کے دیکھیں۔ پھر میں خود ہی اپنی اس فنکارانہ چابکدستی پر حیران
رہ گئی۔ میرے بائیں ہاتھ نے خوبصورت رنگ برنگی چیزیں خاموشی سے یوں کر

دائیں طرف کو خبر نہ ہو۔ بیگ میں انڈیل لیں۔ رنگوں۔ سروں اور خوشبوؤں کی ایک نئی دنیا میرے بیگ میں بند تھی۔ وہ ساتوں رنگ میری مٹھی میں اسیر تھے بظاہر میں نے ایک معمولی سی بوتل پسند کر کے اس کی قیمت ادا کی اڑتے اڑتے قدموں کے ساتھ دوکان سے نکل آئی۔ میں زمین پر نہیں گویا بادلوں پر چل رہی تھی۔ ایک رنگین امنگ میری آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ ایک خالص وحشی جذبہ میرے اندر رقصاں تھا۔

جنابِ والا میرا جی چاہتا تھا سڑکوں پر قہقہے لگاتی پھروں۔ آج پھر دنیا اتنے بہت سے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت زندہ ہو گئی تھی۔ گھر کی دہلیز پار کر کے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ بیگ کھولا اور رنگ و نور کی اس دنیا کو میز پر انڈیل دیا۔ ان سب چیزوں کو مختلف زاویوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا ان کو سونگھا، ان کے رنگوں کو آنکھوں میں بسایا اور تب مدتوں رکے آنسو بہہ نکلے۔

میرے کنبے نے مجھے کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھا اور میز پر لگے اس رنگ و نور کے انبار کو بھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اس نے خوف اور نفرت بھری آواز میں کہا۔ تب میں چونکی اور میں نے سوچا اور خود سے پوچھا ہاں واقعی یہ تم نے کیا کیا؟ اور اس سوچ کے ساتھ ہی وہ رنگ و نور کی دنیا پھر مر گئی۔ وہ سب کچھ مردہ لکڑی میں سے نکلا برادہ بن گیا۔ اور تمام دنیا پر وہ مٹیالا دن محیط ہو گیا۔ چنانچہ جنابِ والا میں نے وہ سب کچھ اٹھایا۔ اور متعلقہ افسروں کو اس واردات کی اطلاع کی۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی جدائی کا دکھ نہیں۔ جب وہ ہاتھ مجھ سے الگ ہوا تو گویا سیاہ آسیب بھی میرا وجود چھوڑ گیا۔ تب میں نے شکر ادا کیا کہ مجھے اس بائیں ہاتھ سے نجات ملی۔ اور اب صرف وہ نور بھرا پاکیزہ دایاں ہاتھ میرا ساتھی تھا۔ اور میں خوش تھی کہتی تھی۔ اے بنتِ حوا۔ تو خوش قسمت ہے کہ آج تیرے وجود کا سیاہ سایہ مٹ گیا۔ اب تیرا یہ مبارک روشن دایاں ہاتھ تیری اچھی اچھی خبریں سب کو دے گا۔

مگر جناب والا اب میں اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔ یہ کل رات ہی کا ذکر ہے

میں اس مٹیالے دن اور مٹیالی رات کی عادی ہو چکی تھی۔ رنگ و نور، حسن و موسیقی کی اس دنیا کی یاد بھی میرے ذہن سے مٹ چکی تھی۔ وہ میرا بایاں ہاتھ سب منحوس یادیں اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔ اور میں سکھ کی نیند سوتی تھی۔ سکھ کی گہری نیند مگر کل رات سکھ کی اس گہری نیند سے میں ایک سرسراہٹ سے جاگ اٹھی جیسے میرے بستر میں کوئی جاندار چل رہا ہو۔ میں نے بیڈ لیمپ روشن کیا۔ اور یہ دیکھ کر میری پیشانی عرقِ ندامت میں ڈوب گئی کہ وہ سرسراتی، کلبلاتی چیز۔ وہ میرا بایاں ہاتھ دوبارہ میرے بازوؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو اس بائیں ہاتھ سے محفوظ رکھنے کی۔ مگر دیکھئے، اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ یہ پھر اسی طرح میری کلائی سے جڑا ہے میرے وجود کا حصّہ ہے۔ جیسے کبھی کاٹا ہی نہ گیا ہو۔ جناب والا کیا آپ بھی یقین نہ کریں گے کہ یہ کٹا تھا مگر پھر زندہ ہو کر آن جڑا! صد حیف ہے میرے وجود پر کہ میں اپنے بائیں ہاتھ سے نجات نہ پا سکی۔